ڈاکٹر ایوب مرزا کی فیض شناسی

تحقیقی وتنقیدی جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس

محقق

شگفتہ پروین

رجسٹریشن نمبر:

68-FLL/MSURDU/F-10

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبہ اردو

شعبہ اردو

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

9/1/2020

Accession No. IH 17547

K

MS
891.4398
ش گ ڈ

۱- اردو ادب ۔ مجموعات ۔
2. فیض احمد فیض ۔ تحقیق ۔

Z015610

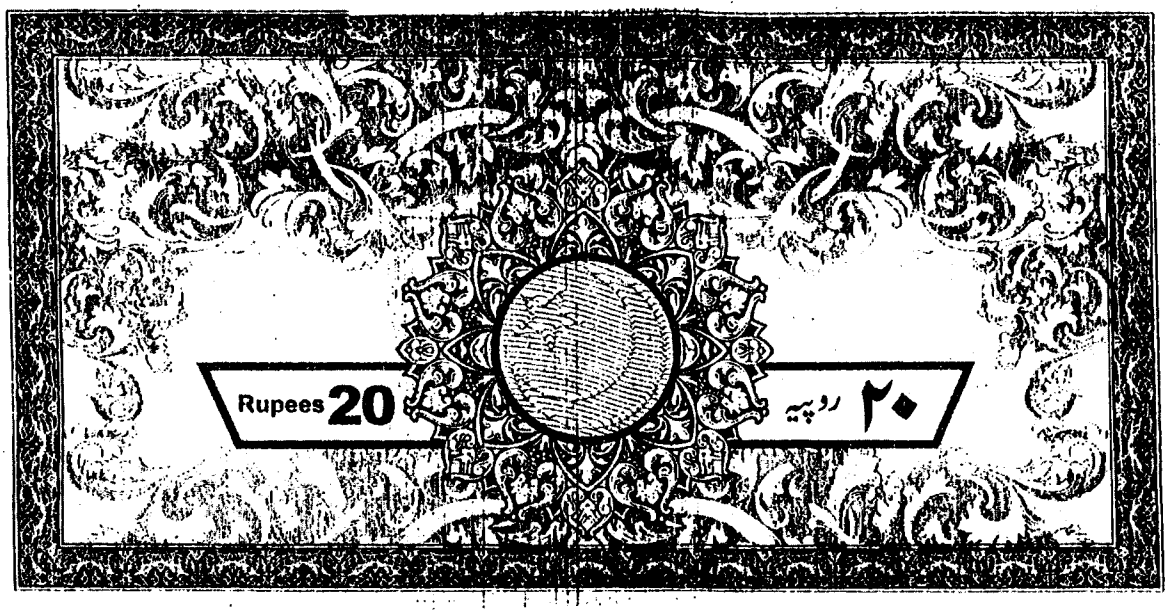

☆ بیان حلفی ☆

منکہ **مسماۃ شگفتہ پروین**، رجسٹریشن نمبر 68-FLL/MSURDU-F-10 حلفاً بیان کرتی ہوں کہ مقالہ میں مکمل اور اصل حوالہ جات دیے گئے ہیں اور یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے۔

مذکورہ بالا بیان میرے علم و یقین کے مطابق بالکل درست ہیں اور کوئی امر مخفی یا پوشیدہ نہ رکھا گیا ہے۔

المحلفہ

Shagufta

مسماۃ شگفتہ پروین

حامل شناختی کارڈ نمبر 32304-8213320-0

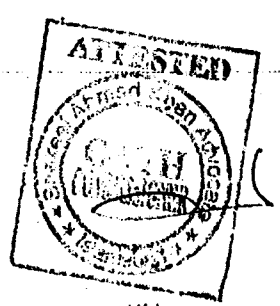

04 DEC 2014

سیریل نمبر **7910**   مالیت **Rs. 20/-**

مورخہ ***04-12-2014***

مسماۃ شگفتہ پروین دختر اللہ ڈتہ، حامل قومی شناختی کارڈ نمبر 32304-8213320-0 سکنہ سیال ہاؤس فاروق نگر، کرم داد قریشی، ڈاکخانہ خاص، تحصیل و ضلع مظفر گڑھ۔

Shagufta

برائے بیان حلفی

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: ***Shagufta Parveen***

Title of the Thesis: "ڈاکٹر ایوب مرزا کی فیض شناسی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"

Registration No: ***68-FLL/MSUrdu/F10***

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of language & Literature, International Islamic University, Islamabad in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

External Examiner: **Dr. Gohar Noshahi** Professor, Al-Hayal, New Abadi Road, Hamza Town, Bara Kahu, Islamabad	***Internal Examiner:*** **Dr. Tayyab Munir** Associate Professor Department of Urdu (Male), IIUI

Supervisor:
Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor
Department of Urdu (Female), IIUI

****

Chairperson
Department of Urdu

Dean
Faculty of Language & Literature

تصدیق نامہ

مجھے شگفتہ پروین کے مقالہ برائے ایم ایس بعنوان ''ڈاکٹر ایوب مرزا کی فیض شناسی'' کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ مکمل ہو چکا ہے۔ یہ کام تحقیق و تنقید کی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے اور ہر لحاظ سے تسلی بخش ہے۔ میری رائے میں یہ مقالہ جمع ہونا چاہیے اور ممتحنین کی تقرری کے لیے فوری کاروائی عمل میں لائی جانی چاہیے۔

شکریہ

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

ابواب بندی

باب اول:

ڈاکٹر ایوب مرزا: ایک تعارف

آباؤ اجداد۔۔۔خاندانی پس منظر۔۔۔والدین۔۔۔پیدائش۔۔۔بہن بھائی۔۔تعلیم (ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ)

۔۔۔شادی/اولاد۔۔۔دوست احباب۔۔۔عادات۔۔۔شخصیت۔۔۔اپنے پیشے سے وابستگی۔۔۔علمی وادبی

ماحول۔۔۔فیض صاحب سے دوستی۔۔۔آثار۔۔۔وفات

باب دوم:

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

فیض شناسی میں اس کتاب کی اہمیت۔۔۔ذاتی تعلقات۔۔۔تعلقات کا آغاز۔۔۔شخصیت کی نادر

جھلکیاں۔۔۔وغیرہ

باب سوم:

''فیض نامہ'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

فیض کا بچپن اور تعلیم۔۔۔ترقی پسند مصنفین اور فیض۔۔۔فوج کی ملازمت۔۔۔فیض نامہ میں فیض کی زندگی

کے متفرق پہلوؤں کی جھلکیاں۔۔۔ان کا جائزہ۔۔۔فیض کی ادب و سیاست سے وابستگی۔۔۔ادب کے بارے

میں آراء۔۔۔فیض کے مذہبی میلانات۔۔۔جیل کی زندگی

باب چہارم:

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' اور ''فیض نامہ'' کا تقابلی مطالعہ

- ☆ **حاصل مطالعہ**
- ☆ **کتابیات**
- ☆ ضمیمہ جات

پیش لفظ

میرے گھر میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان شروع سے تھا۔ میرے والد صاحب ایک سکول ٹیچر تھے ان کی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ جب میں نے ایم فل اردو کی خواہش کی تو گھر والوں نے پسند کیا۔ ذاتی طور پر مجھے افسانوی ادب سے زیادہ دلچسپی تھی اور میں فارغ اوقات میں افسانے اور ناول پڑھا کرتی تھی۔ ایم فل کے آخری سمسٹر میں مقالے کے موضوع کے انتخاب کے وقت شعبہ اردو کے چیئرمین ڈاکٹر رشید امجد نے مجھے ڈاکٹر ایوب مرزا کی فیض شناسی کے حوالے سے کام کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ اس سے قبل ڈاکٹر ایوب مرزا کی فیض شناسی پر کوئی کام نہیں ہوا تھا ۔ ویسے تو فیض شناسی کے حوالے سے بہت کام ہو چکا ہے۔

جب کام کی ابتدا کی تو مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے تب مجھے احساس ہوا کہ پڑھنا آسان ہے مگر کسی کے لکھے گئے کام پر تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینا بہت مشکل کام ہے۔ میں نے اس مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ''ڈاکٹر ایوب مرزا ایک تعارف''۔ اس میں میں نے ڈاکٹر ایوب مرزا کے احوال و آثار بیان کیے ہیں۔

دوسرا باب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' ہے اس باب میں فیض شناسی میں اس کتاب کی اہمیت اور ڈاکٹر ایوب مرزا سے فیض صاحب کے ذاتی تعلقات اور فیض صاحب کی شخصیت کی نادر جھلکیاں۔۔۔ وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے کہ پھر فیض شناسی میں اس کتاب کی اہمیت و افادیت کیا ہے۔

تیسرا باب ''فیض نامہ" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' اس باب میں فیض صاحب کا بچپن اور تعلیم، ترقی پسند مصنفین کا آغاز اور اس میں فیض صاحب کی شمولیت اور فیض نامہ میں فیض صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جھلکیاں اور ان کا

جائزہ اور فیض صاحب کی جیل کی زندگی کا جائزہ کیا گیا ہے۔ چوتھا باب ڈاکٹر ایوب مرزا کی دونوں کتابوں "ہم کہ ٹھہرے اجنبی اور ''فیض نامہ'' کا تقابل کیا گیا ہے۔ دونوں کتابوں کا تقابل کرتے ہوئے مقالے کے تحقیقی وتنقیدی مطالعے سے غیر جانبدارانہ رائے دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد مجموعی جائزہ کے عنوان سے اس تحقیقی مقالے کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس مقالے کو لکھنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کیا گیا۔ اول یہ کہ مواد کی فراہمی ہے کتابیں مجھے بڑی مشکل سے دستیاب ہوئیں۔ ایک تحقیق کے طالب علم کی حیثیت سے اپنے موضوع سے نمٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

زیر نظر مقالے کو مکمل کرنے میں جن کتب و رسائل اور دیگر ماخذات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے ان کی فہرست مقالے کے آخر میں کتابیات میں موجود ہے اگر چہ مقالہ لکھنا مشکل کام ہے مجھے امید ہے کہ اہل علم میری لغزشوں کو طالب علمانہ کوتاہیاں سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیں گے۔

میں اللہ تعالیٰ کی بہت شکر گزار ہوں جس نے ہر موڑ پر میری مدد کی۔ یہاں میں بھی کہنا چاہوں گی کہ اس مقالے کی نگران ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے مقالے کی تکمیل کے ہر مرحلے پر میری ہر ممکن مدد کی۔ میں ان کی بے حد ممنون ہوں انہوں نے میری رہنمائی میں کوئی کمی باقی نہ چھوڑی۔ اگر ان کی مدد میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں شاید یہ مقالہ مکمل نہ کر سکتی۔ آخر میں میں اپنے گھر والوں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اس مقالے کی تکمیل کے لیے ہر طرح کی مدد فراہم کی جس کی وجہ سے میں آج یہ مقالہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

شگفتہ پروین

۲ دسمبر ۲۰۱۴ء

باب اول:

ڈاکٹر ایوب مرزا: ایک تعارف

ڈاکٹر ایوب مرزا: ایک تعارف

ڈاکٹر ایوب مرزا، ۲۱ مئی ۱۹۲۹ء کو میر پور کشمیر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم میر پور، لاہور، جالندھر اور راولپنڈی سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلم ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی اور لندن سے حاصل کی۔ وہ ۵۶-۱۹۵۱ء کی پاکستان کی اولین تنظیم ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانی کارکن اور آل پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے جنرل سکریٹری بھی مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں طلباء تحریک کی قیادت کرتے ہوئے جس میں بے شمار طلباء شہید اور گرفتار ہوئے ڈاکٹر ایوب مرزا نے ڈاکٹر ہارون رشید اور دیگر رہنماؤں کے ساتھ ایک سال جیل بھی کاٹی۔ ۱۹۵۴ء میں حکومت پاکستان نے کمیونسٹ پارٹی کو ممنوع قرار دے دیا تو وہ ملک چھوڑ کر برطانیہ چلے گئے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے ۱۹۵۷ء میں اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز برطابیہ میں سٹی ہسپتال سے کیا اور یہیں سے چائلڈ سپیلائزیشن بھی کی۔ ۱۹۶۴ء میں فیض صاحب کے کہنے پر پاکستان لوٹ آئے اور ایوب خان کے مارشل لاء کے زمانے میں نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہو گئے اور عملی طور پر سیاست میں حصہ لے لیا۔ اس دوران ان کی ملاقات ذوالفقار علی بھٹو سے بھی ہوئی اور یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ ۱۹۶۴ء میں پاک چین دوستی انجمن کی بنیاد پری۔ اس طرح پاکستان اور چین دونوں ملکوں کے درمیان مضبوط دوستی کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے نیشنل عوامی پارٹی میں کسان کمیٹی کو قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور میجر اسحاق، افضل بنگش، غلام نبی کلو کے ساتھ گوجرانوالہ کے اجلاس میں شریک ہوئے جہاں انہوں نے مزدور کسان پارٹی کی بنیاد بھی ڈالی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا کی شادی شیریں بیگم سے ہوئی، بہت ہی نفیس خاتون ہیں اور ان کا تعلق افغانستان کے شاہی خاندان سے ہے۔ ان کے تین بچے ہیں بڑی بیٹی علینہ نے راولپنڈی میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا اور بڑے بیٹے امجد ایوب مرزا نے چین سے ایم بی بی ایس کیا اور سب سے چھوٹے بیٹے سرمد نے ایف اے کر کے تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ دونوں بیٹوں نے ان کی خواہش کا احترام نہیں کیا ایک طرف ایوب مرزا انہیں اپنا دوست سمجھتے تھے اور دوسری طرف ان سے روایتی عزت چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ بچوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی علینہ سلیقہ مند اور ادب کرنے والی لڑکی ہے۔ باپ کے خوابوں کو کسی حد تک اسی نے پورا کیا۔ اسی وجہ سے بڑے بیٹے کے ساتھ ان کا شخصی تضاد تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ امجد کا خیال تھا کہ وہ باپ سے زیادہ ترقی پسند اور جینیس ہے۔ اس کے برعکس ایوب مرزا اس کے ساتھ چھوٹے بچوں کی طرح سلوک کرتے تھے۔ امجد نے قیام چین کے دوران کئی مشکلات کھڑی کیں، یہاں تک کہ وہ امجد کو خط لکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد:

> ''ایوب مرزا صاف گو شخص تھے۔ ان کی یہ خوبی ان کی خرابی بن گئی تھی کہ منہ پر بات کہہ دیتے تھے۔ دوستوں کے کام بڑھ چڑھ کر کرتے لیکن بعد میں کوئی ایسی بات کر دیتے کہ جس پر احسان کرتے وہی انہیں برا بھلا کہتا۔ بنیادی طور پر وہ ایک ترقی پسند ادیب اور دانشور تھے۔ فیض صاحب ہی کے کہنے پر لندن سے ملازمت چھوڑ کر پاکستان آئے تھے۔ ان کا جھکاؤ روس کی بجائے چین کی طرف تھا۔ انہوں نے پاک چین دوستی ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلے صدر بھی چنے گئے''۔[1]

جب ضیاء حکومت کے خلاف تحریک شروع ہوئی امجد ایوب بھی اس میں پیش پیش تھا پکڑا گیا اور سزا بھی ہوئی لیکن کم عمری کی وجہ سے بچ گیا۔ اسی وجہ سے ایوب مرزا نے کوشش کر کے اسے چین بھجوا دیا تا کہ وہاں سے میڈیکل کی تعلیم

حاصل کر لے۔ وہاں جا کر اس نے سیاست شروع کر دی اور ایک اردو رسالہ کا اجرا کیا جو ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ سفارت خانہ چین نے ڈاکٹر ایوب مرزا سے شکایت کی ان کا بیٹا پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتا تھا ۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں کہ ایوب مرزا نے یہ کام میرے حوالے کر دیا تا کہ میں امجد سے خط و کتابت کروں اور اُسے سمجھاؤں۔ اسی وجہ سے ایوب مرزا اپنے دونوں بیٹوں سے ناراض رہتے تھے۔

ایوب مرزا بچوں کے امراض کے ماہر تھے اور انہیں کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ جامع مسجد روڈ پر اپنا کلینک بند کر کے کسی اچھے علاقے میں ماہر امراض بچگان کی حیثیت سے بڑا ہسپتال بنالیں لیکن وہ کہتے کہ اس علاقے کی گلیوں کے غریب بچے کہاں جائیں گے۔ ان کا خواب تھا کہ وہ اسی کلینک کو بچوں کے ایک اچھے ہسپتال میں بدل دیں گے۔ جہاں ان کا بیٹا امجد ان کی معاونت کرے گا لیکن امجد کو شروع سے سیاست میں دلچسپی تھی ۔ وہ ایم بی بی ایس تو کر آیا تھا لیکن با قاعدگی سے پریکٹس نہ کر سکا کیوں کہ اس کی دلچسپی صحافت اور عملی سیاست میں تھی۔

ایوب مرزا بچوں کے امراض کے ماہر ہونے کی وجہ سے اگر چاہتے تو من چاہی کمائی کر سکتے تھے لیکن ان کے پاس دور دراز سے لوگ بچوں کے علاج معالجہ کے لیے آتے تھے۔ وہ ان سے وہی فیس لیتے تھے جو عام مقرر تھی۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی۔ غصیلے مزاج کی وجہ سے مریضوں کو بہت ڈانٹتے تھے ، جواباً مریض مسکرا دیتے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا جب تک ہارلے سٹریٹ راولپنڈی میں رہے با قاعدگی سے شام کو ادیبوں کی محفل میں آتے اور حلقہ میں بھی شرکت کرتے۔ اسلام آباد میں ان کا جو گھر تھا وہ کرائے پر تھا۔ وہ وہاں جانا نہیں چاہتے تھے لیکن بیگم اور بچوں کے اسرار پر اسلام آباد شفٹ ہو گئے اور ان کا حلقوں میں آنا جانا کم ہو گیا تھا۔

ایوب مرزا ''فیض شناسی'' میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' اب ایک حوالے کی کتاب کے طور پر شمار ہوتی ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''فیض نامہ'' ہے جو انڈیا سے شائع ہوئی ہے اور ان کا ایک اور

اہم کام دادا امیر حیدر پر سوانحی ناول ہے۔ جو پہلی بار ''دام موج'' کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں ایوب مرزا نے اسے نئے سرے سے لکھا۔ یہ ناول ''داستان امیر حیدر'' کے نام سے کلاسیک لاہور سے شائع ہوا۔ بنیادی طور پر یہ ایک دستاویزی ناول ہے۔ دادا امیر حیدر نے اپنی یاداشتیں شکستہ تحریر میں لکھی تھیں۔ اس کی ایک نقل مرزا صاحب کے پاس تھی اور دوسری لطیف کاشمیری مرحوم کے پاس تھی۔ ۹۲۔۱۹۸۹ء میں فلم سنسر بورڈ کے ممبر بنے۔ ۱۹۹۰ء میں ٹانگ میں خون کا کلاٹ بننے کے بعد علاج کے لیے اپنی بیٹی علینہ کے پاس گلاسکو منتقل ہو گئے۔ ۱۹۹۶ء میں پاکستان لوٹے تو فالج کا شدید حملہ ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں ''برگ جہاں دیدہ'' کے نام سے خودنوشت تحریر کی۔

ان کی کتابیں ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' اور ''فیض نامہ'' جنوبی ایشیاء کے سیاسی ادب کی شاہکار کتب مانی جاتی ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ایوب مرزا نے پروفیسر سجاد حیدر کے ساتھ مل کر رومانیہ کے قومی شاعر کے مجموعے کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد:

''ایوب مرزا بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بہت نیچے سے اوپر آئے تھے۔
کہتے تھے، میرا باپ ایک عام شخص تھا۔ میں سیلف میڈ شخص ہوں'' ۲

سیاست سے دلچسپی انہیں کالج کے زمانے ہی سے تھی چنانچہ کراچی میں میڈیکل کالج میں پڑھنے کے دوران انہوں نے طلبہ کی انجمن بنائی جو پاکستان میں غالباً پہلی ترقی پسند تنظیم تھی۔ ایوب مرزا ایک پکے ترقی پسند ادیب اور دانشور تھے۔ فیض صاحب کے علاوہ میجر اسحاق اور افضل بنگش سے ان کی دوستی تھی۔ وہ ترقی پسندوں کے لیے کام کرتے تھے۔ ڈاکٹر رشید امجد ڈاکٹر ایوب مرزا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایوب مرزا کے مزاج میں محبت اور غصہ دونوں موجود تھے۔ محبت کے عالم میں سراپا
انکسار ہو جاتے، غصہ آتا تو یہ لحاظ نہ رہتا کہ کس سے مخاطب ہیں۔ لیکن دوستوں کے

دوست تھے۔محفل کے آدمی تھے۔اسلام آباد جا کر انہیں تنہائی کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔امجد نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔علینہ شادی کے بعد برطانیہ منتقل ہوگئی تھی۔سرمد نے بھی تعلیم چھوڑ کر ادھر کا رخ کیا۔امجد نے دو شادیاں کیں، دونوں ناکام ہوگئیں۔بیگم کے اکثر خاندان والے برطانیہ میں تھے۔ایوب مرزا کے بڑے بھائی یعقوب مرزا اور دیگر رشتہ دار بھی وہیں تھے ، چنانچہ بیگم کے اصرار پر انہوں نے رخت سفر باندھا۔جاتے ہوئے ان کی اداسی دیکھی نہیں جاتی تھی۔''[۳]

۱۵ اگست ۲۰۱۰ء میں معدہ میں شریان پھٹ جانے کی وجہ سے بہت خون بہہ گیا، بعد میں ہسپتال میں دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔۱۸ اگست ۲۰۱۰ء میں سکاٹ لینڈ کے شہر گلاسکو میں سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں دفن ہوئے۔

ایوب مرزا کی ادبی خدمات:

اگر ہم ڈاکٹر ایوب مرزا کی ادبی خدمات کا جائزہ لیں تو انھوں نے بہت ساری کتابیں لکھ کر اردو ادب میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا۔جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کا تجزیہ

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کو فیض صاحب کی سوانح عمری کہا جا سکتا ہے اور اس کی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ فیض صاحب کی زندگی ہی میں لکھی گئی۔نہ صرف یہ بلکہ فیض صاحب کی نظر سے بھی گزری۔

ایوب مرزا کا تعلق میڈیکل کے شعبے سے ہے۔ وہ کوئی ادیب یا سوانح نگار نہیں ہیں بلکہ فیض صاحب سے ذاتی تعلقات کی وجہ سے انہیں فیض صاحب پر لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' ایک سوانح عمری ہے۔ جس کو انہوں نے ۱۹۷۶ء میں شائع کروایا۔ اس کتاب کے متعلق ڈاکٹر ایوب مرزا مزید لکھتے ہیں کہ جب فیض صاحب کو علم ہوا تو وہ بولے بھئی ہمارے بارے میں لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟۔ میں تو گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ فیض کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تو خود ایک تاریخ ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے زبان و بیان کی کمزوریوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس کتاب میں واقعاتی اور زمانی لحاظ سے شاید کوئی ربط نظر نہ آئے۔ کیونکہ فیض صاحب سے گفتگو مختلف اوقات میں ہوتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں میں بھی کہنا چاہوں گی کہ اس کتاب میں ربط کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ واقعات کا زمانی اعتبار سے کوئی تسلسل نہیں ہے۔ پھر ایوب مرزا نے اس کتاب میں ان دوستوں کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے خاص طور پر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ایوب مرزا کا کمال یہ ہے کہ فیض صاحب کے خاندانی حالات، ان کے گھریلو مشاغل کی تفصیلات اور ان کے متعلقہ معاملات جہاں تک ممکن ہو سکا بیان کیے۔ یہ مرحلہ اس لیے مشکل تھا کہ فیض صاحب اس موضوع پر خود کچھ لکھنے یا کہنے سے پرہیز کرتے تھے اور پھر دوسرے ذرائع سے معلومات حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں انفرادی طور پر یہ خوبی بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ہی

نہایت کمال کے کارساز بھی تھے۔ انہوں نے کئی لوگوں کے گھر آباد کیے۔ انہیں خوشیاں دیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کو فیض صاحب کی اس خصوصیت کے بارے میں پتہ چلا تو وہ حیران ہوئے کہ فیض صاحب جیسی کم گو، کم سخن شخصیت بھی ایسے مسائل کو اچھے طریقے سے نبھا سکتی ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں۔

''آپ کے لگائے ہوئے پودے کسی طور بانجھ نہیں ہو سکتے۔ پوری دیگ میں سے

چاول کا صرف ایک دانہ پرکھا جاتا ہے۔ ہم تو تین گھروں سے گھوم آئے ہوئے

ہیں۔'' ۴

ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ میں نے فیض صاحب سے پوچھا کہ آپ کا بچپن کیسا تھا؟ ہم تو خان بہادر کی اولاد تھے مگر رشتہ دار تو غریب تھے۔ گاؤں میں سبھی خان بہادر تھوڑے ہوتے ہیں۔ چونکہ فیض صاحب نے اپنا بچپن ناز و نعم میں گزارا تھا۔ ایک بار ڈاکٹر یوب مرزا نے فیض صاحب سے اپنے انٹرویو کے دوران پوچھا کہ آپ نے ایک کامیاب زندگی گزاری ہے زندگی میں کوئی پچھتاوا ہے تو فیض صاحب بولے میں قرآن پاک حفظ کرنا چاہتا تھا لیکن میں چند سپارے حفظ کر سکا اور دوسری بات یہ کہ میں کرکٹر بننا چاہتا تھا اور نہیں بن سکا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے ابتدائی زمانے میں ترقی پسند تحریک میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور پھر ۱۹۳۶ء کی کانفرنس کے بعد تو انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے آپ کو منوانا شروع کیا تھا۔ برصغیر کی اردو دنیا میں ان کی شہرت تھی۔ جب ان کی شاعری کی کتاب ''نقش فریادی'' شائع ہوئی تو اقبال کے بعد ان کی شاعری سب سے زیادہ پڑھی جانے لگی۔ اس میں کچھ رومانوی شاعری بھی شامل ہے۔ ''نقش فریادی'' فیض صاحب کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جب لوگوں نے اسے پڑھا ہوگا تو اس وقت اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ ایک بالکل مختلف آواز ہے مگر جو اپنے ماحول سے جڑی ہوئی ہے اور اس کا تعلق اپنی تہذیبی روایت سے بھی ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں اختر شیرانی اور جوش، حفیظ جالندھری اور صوفی تبسم وغیرہ بھی نمودار ہوئے تھے۔ مگر فیض صاحب نے ان کے ہوتے ہی اپنی الگ پہچان کرائی تھی۔ مزید ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کی زندگی بے انتہا تکلیف دہ مگر بے حد موثر ہے۔ کیونکہ دنیا بھر کی حبسیہ شاعری میں ''زنداں نامہ'' کو بہت اہمیت حاصل ہے ناظم حکمت، پابلو نرودا، اور ہمارے زمانے میں حبیب جالب سمیت اور بھی بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں لیکن حبسیہ شاعری میں جو مقام ''زنداں نامہ'' کو حاصل ہے وہ شاید ہی کسی اور کتاب کو حاصل ہو۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے راولپنڈی سازش کا بھی ذکر کیا ہے۔ قصہ صرف اتنا سا ہے کہ جنرل اکبر خان، فیض صاحب کے دوست تھے جو غالباً پاکستانی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر

فائز تھے بیگم اکبر خان اور اکبر خان سے فیض صاحب کی دوستی تھی۔ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو فوج میں انتشار پھیلا کر پاکستان میں انقلاب لانا چاہتے ہیں۔آخر کار حکومت نے انہیں گرفتار کیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔۱۹۵۵ء میں فیض صاحب کو قید و بند سے رہائی ملی اور سجاد ظہیر صاحب ہندوستان چلے گئے جبکہ فیض صاحب لکھتے ہیں کہ بات اتنی تھی کہ ہم لوگوں نے بیٹھ کر بات کی کہ اس ملک میں کیا ہو رہا ہے۔کس طریقے سے اس ملک کے حالات بہتر بنائے جائیں۔ ملک کو معرض وجود میں آئے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔اس طرح کے مسائل تھے جن پر بات ہوتی رہتی تھی۔چنانچہ دوستوں سے ہمارے ذاتی مراسم تھے اس لیے ہم بھی ان کی گفتگو میں شامل ہو جاتے تھے۔انہوں نے ہماری بات سنی اور ہم نے ان کی بات سن لی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومت کا تختہ نہیں الٹنا چاہیے جبکہ ہم پر مقدمہ اس کے برعکس بنا۔''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، فیض صاحب کی سوانح عمری ہے جس میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے ان کی زندگی کے مختلف واقعات کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔

فیض نامہ ایک تعارف:

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کے بعد فیض صاحب سے متعلق ڈاکٹر ایوب مرزا کی اہم اور دلچسپ کتاب ''فیض نامہ'' کے نام سے منظر عام پہ آئی ہے۔پہلی بار کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔اسکی مقبولیت کے باعث اسے دوبارہ ۱۹۷۹ء میں خدا بخش لائبریری پٹنہ نے شائع کیا۔اس کا حرف آغاز محمد ضیاء الدین انصاری نے تحریر کیا اور ڈاکٹر ایوب مرزا نے خود اس کا ابتدائیہ لکھا ہے اور یہ کتاب ۶۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ یہ کوئی جامع اور روایتی طرز کی سوانح عمری نہیں ہے۔بلکہ بکھرے ہوئے خیالات ہیں جنہیں یادوں کی ایک مضبوط لڑی میں پرونے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔کتاب کے پہلے ۳۰ صفحات میں فیض صاحب کے والدین کے بارے بیان کیا گیا ہے۔کسی زمانے میں ایک راجہ ہوا

کرتا تھا۔جس کا نام سین پال تھا اور اس کا تعلق سہارنپور سے تھا۔اس کی اولاد میں سے ایک نے اسلام قبول کرلیا تھا۔فیض کے والد سلطان محمد خاں اسی شاخ میں سے تھے۔فیض صاحب کے پردادا سربلند خاں اور دادا صاحب زادہ خاں کالا قادر کے رہنے والے تھے۔یہ لوگ غریب اور معمولی سے کاشت کار تھے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' فیض صاحب کے ان شب وروز کا بھی ذکر کیا ہے جو کالج کے زمانے میں خواتین ومرد اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بسر ہوئے۔اس کے بعد فیض صاحب کی شادی کا تذکرہ بھی ہے اور یہ بھی بتایا کہ نکاح شیخ محمد عبداللہ نے سری نگر میں کرایا تھا اور خطبہ نکاح بھی انہوں نے پڑھا تھا۔ایوب مرزا نے جو دو باتیں یہاں بیان کی ہیں وہ زیادہ اہم ہیں۔ایک ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے فیض کے اختلافات، دوسرے گاندھی جی اور محمد علی جناح دونوں کی وفات اور اس پر فیض صاحب کا ردعمل اور اس کے چند مہینے بعد سازش کے مقدمے میں فیض کی گرفتاری۔ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ سازش میں شریک ہوئے تھے اور اکبر خان اور سجاد ظہیر سے مل کر لیاقت علی خان کی حکومت کو برطرف کر کے خود حکومت پر قابض ہونے کا پلان بنا رہے تھے۔ڈاکٹر ایوب مرزا بیان کرتے ہیں کہ فیض صاحب کی شخصیت میں دو بڑی باتیں شامل ہیں۔ایک شدید وطن دوستی جس میں ہر قسم کی نا انصافی کے باوجود کبھی بھی کمی نہیں آئی اور اس وطن دوستی کا اہم حصہ عوام دوستی تھی۔دوسرے ان کی مزاج کا دھیما پن۔اپنی گھریلو زندگی میں ہر قسم کے اتار چڑھاؤ کے باوجود ایک خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔یہ توازن اور اعتدال ہی فیض صاحب کی شاعری اور شخصیت کا مرکز ہے۔فیض صاحب اپنی زندگی میں بیرون ممالک کے کئی دورے کیے اور سیدھے اپنے گھر ہی تشریف لاتے۔ایک دفعہ فیض صاحب لندن سے واپس لوٹتے ہیں انہیں معلوم بھی تھا کہ وہ ہوائی جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر جائیں گے۔کئی دوستوں نے مشورہ بھی دیا کہ وہ وطن واپس نہ جائیں لیکن انہوں نے کسی کی نہ سنی اور پھر ویسا ہی ہوا وہ جیل چلے گئے۔اب بھی وہ چار پانچ ماہ سرکاری مہمان رہے۔وہاں سے نکلے تو عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ پھر بنگلہ دیش کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور فیض نے سقوط مشرقی پاکستان کے باشندوں کے

درمیان نفرت اور جنگ کے بڑھکتے ہوئے شعلے بھی دیکھے۔ پھر بنگال کے سفر پر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ روانہ ہوئے اور ''ڈھاکہ سے واپسی'' پر خوبصورت نظم بنگلہ دیش کے رہنے والوں کے نام کی ہے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد

پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

اس کے علاوہ فیض صاحب کے کئی اور بھی پہلو بھی اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں جو بہت انوکھے ہیں۔ فیض اور فلم سازی ، بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ فیض نے فلم سازی میں بھی کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ فیض صاحب نے بنگالی مصنف کے ناول کی بنیاد پر ''جاگو ہوا سویرا'' فلم کے مکالمے لکھے مگر مکمل ہونے پر وزیر اطلاعات نے اس کی نمائش پر پابندی لگا دی کہ اس فلم سے اشتراکیت کی بو آتی ہے اور اس فلم کو امریکہ سے رابرٹ فلاہارٹی ایوارڈ اور بوسٹن ایوارڈ بھی ملے۔ اس کے بعد کئی اور فلمیں بھی بنائیں لیکن جس محنت سے انہوں نے فلم بنائی وہ ''دور ہے سکھ کا گاؤں'' اس کا دوسرا نام تھا ''پریت کی ریت'' مگر یہ معاملہ اس قدر الجھا کہ یہ فلم ریلیز نہ ہو سکی۔ ڈبوں میں بند کر کے لندن میں رکھ دی۔ فیض صاحب کو اس بات کا بہت دکھ ہوا تھا۔ بقول ایوب مرزا:

''فیض صاحب کے اعتماد کو اس قدر شدید دھچکا پہنچایا کہ میں نے یہاں تک سنا ہے

فیض صاحب خودکشی کی بات کرنے لگے تھے'' ۵

آخر کار اس معاملے کو ادھر ہی ادھورا چھوڑنا پڑا۔ پھر قدرت اللہ فاطمی کی معاونت سے مہاتما بدھ یونیورسٹی کے سکونتی، درسی اور بین الاقوامی درسگاہ کے قیام کا مرحلہ شروع ہوا مگر اس منصوبے کو مکمل کرنے سے پہلے فیض صاحب ۱۹۸۴ء میں انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کے ہندوستان کے کئی اور دوروں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ایک زمانے میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے انہیں پروفیسر بننے کی پیشکش کی تھی مگر پاکستان کی وزارت خارجہ سے اس کی اجازت

نہ ملی اور یہ تجویز عمل میں نہ آسکی پھر مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ نے انہیں کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال کے نام پر وفیسر شپ قائم کر کے مدعو کیا مگر اس وقت وہ بیروت میں رسالہ ''لوٹس'' کی ادارت قبول کر چکے تھے اور فلسطینی مجاہدین کے ساتھ ان کی جنگ میں ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے کئی سفر کیے اور ان میں بھوپال، لکھنؤ، دہلی، حیدر آباد، بمبئی ،کلکتہ اور الہٰ آباد کے یادگار سفر بھی شامل تھے۔ اکثر جگہوں پر اتنا مجمع جمع ہو جاتا تھا کہ پنڈال چھوٹا پڑ جاتا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کی شخصیت کی ایک ہلکی سی مگر خوبصورت تصویر ''فیض نامہ'' میں بڑی دلیری اور دل کشی سے پیش کی ہے اور اس کام کے لیے انہوں نے بہت محنت کی ہوگی۔ یہ ایک سوانح عمری نہیں بلکہ پورے ایک دور کا بیان ہے۔ یہاں پر میں فیض صاحب کے ایام اسیری کے دوران لکھے گئے خطوط کا ذکر کرنا چاہوں گی۔ جو کتابی صورت میں "صلیبیں مرے دریچے میں" مرزا ظفر الحسن نے مرتب کیے ہیں یہ ۱۳۵ خطوط ہیں فیض صاحب نے یہ خطوط حیدر آباد، کراچی، منٹگمری کی جیلوں سے لکھے اور یہ خطوط ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء کے عرصے میں تحریر کیے گئے۔ یہ خطوط انگریزی میں ''ڈیر ہارٹ ٹو فیض ان پریزن'' کے نام سے شائع ہوئے تھے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں ک میرے لیے اہم مسئلہ تھا کہاں سے شروع کروں پھر خیال آیا کہ اپنی موت کی خبر کے حوالے سے آغاز کروں۔ اس سلسلے میں افتخار عارف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۸۴ء کی بات ہے کہ لندن میں ایک دن مجھے بی بی سی سے فون آیا کہ مرزا ظفر الحسن صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ مرزا ظفر الحسن فیض صاحب کے قریبی دوست تھے۔ اب ایوب مرزا کی صاحب کی بھی فیض صاحب سے دوستی تھی اور پھر بی بی سی والوں نے کہا تھا کہ یہ پیغام فیض صاحب تک پہچادوں اور اگر ممکن ہو سکے تو ان سے پیغام لے بھی لوں۔ جب میں نے بیروت فون کیا تو پتہ چلا کہ فیض صاحب بیروت سے جا چکے ہیں اور وہ پیرس جائیں گے، وہاں پر ان سے بات بھی ہوگئی۔ میں نے ان کو بتایا کہ مرزا صاحب فوت ہو گئے ہیں اور آپ ان کے لیے پیغام دے دیں۔ انہوں نے ڈاکٹر ایوب مرزا کی تعزیت لکھ کر مجھے بھیج دی۔

بقول افتخار عارف:۔

''آج افتخار عارف نے ٹیلی فون پر بتایا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا چلے گئے۔ابنائے وطن

جہاں جرات اور مروت، دیانت و متانت اور اخلاص و وفا،صدق وصفا، کا سراغ

ڈھونڈنے ہی سے کسی کی ذات میں یک جا ملتا ہے''[۲]

ایوب مرزا بحیثیت مترجم:

ڈاکٹر ایوب مرزا نے ترجمہ کا کام بھی بخوبی نبھایا ہے۔ذیل میں ان کی کتاب کا ذکر کروں گی۔

میہائی ایمی نیسکو کی نظموں کا اردو ترجمہ:

میہائی ایمی نیسکو کی نظموں کا اردو ترجمہ ''نظمیں'' ڈاکٹر ایوب مرزا نے پروفیسر سجاد حیدر ملک کے ساتھ مل کر کیا۔یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی نے شائع کی۔یہ کتاب ۲۷۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کا پیش لفظ پروفیسر فتح محمد ملک نے لکھا ہے اور حرف چند ڈاکٹر ایوب مرزا نے خود تحریر کیا ہے اور اس کتاب کا انتساب عظمت انسان، رومانیہ کے عوام اور سرزمین کے نام کیا گیا ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے نقاد، شاعر اور انگریزی ادبیات کے استاد سجاد حیدر ملک کے باہمی تعاون سے رومانیہ کے قومی شاعر میہائی ایمی نیسکو کی منظومات کو اردو زبان و ادب میں شامل کر کے ہمیں حیران کر دیا ہے۔یہ منظومات اردو ادب میں ایک یہ اہم اضافہ ہیں۔میہائی ایمی نیسکو کی شاعری اردو ادب میں ہمارے لیے ایک طرف اجنبی بھی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس میں مانوسیت بھی پائی جاتی ہے۔اس مانوس و اجنبیت کا راز اس حقیقت میں چھپا ہوا

ہے کہ رومانیہ کی شعری روایت بنیادی طور پر مغربی روایت کا تسلسل ہوتے ہوئے بھی ہماری شعری روایت سے ہم رشتہ ہے۔ نہ صرف بلکہ مشرقی یورپ کے ساتھ مسلمانوں کے صدیوں پر محیط سیاسی وتہذیبی رسم ورواج کے اثرات زیر بحث کتاب میں شامل غزل سے ہی نہیں بلکہ انسان اور کائنات، حسن وعشق اور موت کے باب میں چھپے ہوئے مابعد الطبیعاتی سوالات سے بھی واضح ہیں جو ایمی نیسکو کی شاعری کو عالمگیر بنا دیتے ہیں۔

پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں ایمی نیسکو، مرزا غالب کے ہم عصر ہیں اور جب میں ان کی نظم ''دعا'' پڑھ رہا تھا تو مجھے غالب بھی یاد آرہے تھے۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جانداد ہوائے سر راہگذار تھا
ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اسی طرح شہر آشوب: ۲ کے مطالعے کے دوران بھی میں غالب کو گنگنانے لگا:

درد دل لکھوں کب تک ، جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا ہے

میہائی ایمی نیسکو اور مرزا غالب کی شاعری میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ دونوں کی سوچ اور طرز فکر واحساس ایک جیسا ہے۔ اور دوسری وجہ دو شاعر جس معاشرے میں زندگی گزار رہے تھے۔ وہاں ایک فرسودہ

نظام رائج تھا وہ اس نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اپنے معاشرے پر انقلاب فرانس کی بدولت ایمی نیسکو غالب کی بدولت تشکیک کی منزل پر رکنے کی بجائے انقلاب کی طرف بڑھتے چلے گئے اور پھر ایمی نیسکو نے اپنی نظم "سلطان اور مزدور" میں نصف صدی پہلے سوشلسٹ انقلاب کی خبر دے دی تھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایک شام میں ڈاکٹر پیٹر یسکو کے پاس کافی پینے گیا۔ انہوں نے مجھے ایمی نیسکو کی نظموں کی انگریزی ترجمہ اس انداز سے سنانا شروع کیا ایمی نیسکو کی شاعری رگ و پے میں سماتی چلی گئی اور ہم نے جوش میں آکر اسے اردو میں ترجمہ کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ مگر سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کام میں ہماری معاونت کرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ آخر کار ہم نے سجاد حیدر ملک کو تیار کیا کہ اس کام میں ہماری مدد کریں۔ مگر ایک سال گزر گیا ترجمے کا کام صحیح طریقے سے شروع نہ ہو سکا۔ آخر کار میں نے خود ہی ایمی نیسکو سے ملنے کا ارادہ کر لیا۔ میہائی ایمی نیسکو کو انگریزی سے سی۔ ایم پوپسکو نے ترجمہ کیا لیکن پوپسکو انیس برس کی عمر میں خونی زلزلہ میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ پوپسکو سائنس کا طالب علم تھا۔ لیکن اس کا کیا ہوا ترجمہ کمال کا تھا اور ایمی نیسکو بھی ۳۸ برس کی عمر میں وفات پا گیا تھا۔ بقول ایوب مرزا:

> ''اس نے شاعری کو نئی معراج تک پہنچا دیا اور رومانیہ کی شاعری کو ایک نیا فکری اور فنی موڑ عطا کیا۔ ایمی نیسکو روایات کا احترام کرتے ہوئے اپنے عہد کا جدید شاعر تھا۔ وہ شعری ہیجان اور تصورات کو نظم کرتے ہوئے اکثر، ادق قافیوں اور مشکل بحور، اوزان کے چکر میں نہیں پڑتا۔''[۸]

آخر میں ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ میں کارنیل۔ ایم۔ پوپسکو جیسا ترجمہ پیش تو نہیں کر سکا مگر ایمی نیسکو جیسے شاعر کو اردو میں متعارف کروانے میں اپنی سی کوشش ضرور کی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ایمی نیسکو کی شاعری کو اردو ادب میں متعارف کرانے میں جس ذہانت اور لگن کا مظاہرہ کیا اس کی مثال نہیں ملتی امید ہے کہ ایمی نیسکو کی شاعری اردو ادب میں متنوع امکانات کا

سرچشمہ ثابت ہوگی۔

حوالہ جات

۱۔ امجد رشید، ڈاکٹر، ''جدید ادبی تناظر''، الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، راولپنڈی، ص ۲۱۱۔۲۱۰

۲۔ ایضاً، ص ۲۱۴۔۲۱۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔۲۱۴

۴۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۲۵

۵۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور ص ۳۶۹

۶۔ راشد حمید، ڈاکٹر، ''فیض بہ نام افتخار عارف''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۱۹۶

۷۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، حیدر سجاد ملک، ''نظمیں''، ندیم پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء، راولپنڈی، ص ۱۷۔۱۶

۸۔ ایضاً، ص ۲۰

باب دوم:

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

ڈاکٹر ایوب مرزا فیض شناس ہیں وہ کسی ادبی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ ادب میں ایک مقام پیدا کرنے کے لیے فیض پر دو کتابیں تحریر کیں۔ پہلی کتاب ہم کہ ٹھہرے اجنبی اور دوسری کتاب فیض نامہ ہے۔ دونوں کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھی گئیں اور بے حد مقبول ہوئیں۔ چونکہ ہم کہ ٹھہرے اجنبی کتاب فیض شناسی میں بے حد مقبول ہوئی۔ اسے فیض صاحب کی سوانح عمری کہا جا سکتا ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ فیض صاحب کی زندگی میں ہی تحریر کی گئی اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ فیض صاحب کی نظر سے بھی گزری۔ فیض شناسی میں اس کتاب کی بہت اہمیت ہے۔ ہمیں فیض صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً فیض صاحب ایک باکمال شاعر تو تھے ہی۔ مگر اس کے ساتھ انہیں خوبی حاصل تھی کہ انہوں نے لوگوں کے گھر آباد کیے۔ انہیں خوشیاں دیں۔ وہ نہایت کمال کے کارساز بھی ہیں۔

فیض صاحب پنڈی کلب سے نکلے تو گھر جانے کی بجائے سول لائنز چلنے کو کہا۔ ایوب مرزا حیران رہ گئے کہ اب فیض صاحب مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہاں جانا ہے کہنے لگے بائیں مڑ جاؤ۔ آخر کار دائیں بائیں مڑنے کے بعد ایک بنگلے کے پاس گاڑی جا کر روکی فیض صاحب کہنے لگے تم اسی شہر میں رہتے ہو ان لوگوں سے ملتے جلتے رہا کرو۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں۔ آخر کار ایک بنگلے سے ایک خوبصورت خاتون نکلیں اور فیض صاحب سے ملیں۔ ہم تینوں ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئے فیض صاحب نے ہمارا تعارف کروایا بڑے معروف ڈاکٹر ہیں۔ ایوب مرزا اور خاتون نے ہم سے پوچھا آپ چائے میں چینی ایک چمچ پیتے ہیں تو ہم نے کہا جی۔ اتنے میں ہم نے صاحب

خانہ سے اجازت چاہی تو صاحب خاتون بھی تشریف لے آئے۔ وہ فیض صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ہم تو فیض صاحب کا زندگی بھر احسان مند رہیں گے انھیں کی وجہ سے ہماری شادی ہوئی۔ اب دو بچے ہیں ملازمت بھی ہے بنگلہ اور کار بھی ہے۔ ہم نے دل میں سوچا کہ فیض صاحب کے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے کبھی نہیں مرجھا سکتے۔ اسی طرح ہم نے تین چار گھروں کا دورہ کیا وہاں جا کر پتہ چلا کہ فیض صاحب کی مہربانی سے ان کے کچھ مسائل تھے جو حل ہو گئے تھے اور وہ فیض صاحب سے مل کر کتنے خوش تھے اور دعائیں دیتے رہے ظاہر ہے یہ وہ لوگ تھے جن کی شادیوں سے پہلے گتھیاں الجھ جاتی ہیں جنہیں فیض صاحب نے خوش اسلوبی سے سلجھا دیا تھا۔ وہ فیض صاحب کی اس خوبی سے ناواقف تھے۔ جب وہ لوگوں سے ملے جو بہت ہی خوش تھے انہیں حیرت ہوئی فیض صاحب جیسی کم گو، کم سخن شخصیت بھی شادی بیاہ کے کام کو احسن طریقے سے نبھا سکتی ہے۔ آخر میں فیض صاحب نے سکون کا سانس لیا یہ لوگ خوش ہیں اور انہیں خوش رہنے دیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں۔

''آپ کے لگائے ہوئے پودے کسی طور بانجھ نہیں ہو سکتے۔ پوری دیگ میں سے چاول کا صرف ایک دانہ پرکھا جاتا ہے۔ ہم تو تین گھروں سے گھوم آئے ہیں۔'' [1]

فیض صاحب کی ذات سے سب کو سکون ملتا تھا اور لوگوں کے مسائل بھی حل ہو جاتے تھے یہ تھی فیض صاحب کی انفرادیت۔ یہاں پر فیض صاحب نے ڈاکٹر ایوب مرزا سے انٹرویو کرتے وقت واقعات کو ترتیب سے پیش نہیں کیا۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ایک دن میں فیض صاحب کا انٹرویو لے رہا تھا اچانک مجھے ان کی انگلی پر زخم کا نشان نظر آیا اور فیض صاحب روس اور چین کے مسئلے میں الجھے ہوئے تھے۔ میں ان کی گفتگو کو نظر انداز کر کے زخمی شدہ انگلی کی وجہ جاننا چاہی تو فیض صاحب نے بتایا ہم نے بچپن میں ایک ایڈونچر کیا تھا اپنے بڑے بھائی حاجی طفیل احمد کے ساتھ خان بہادر کی اولاد ہونے کی حیثیت سے گاؤں گئے تھے۔

بھئی ہم تو خان بہادر کے بچے تھے مگر رشتہ دار تو غریب تھے، گاؤں میں سبھی خان بہادر تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ فیض صاحب نے اپنے گاؤں کے سفر اور وہاں چکی کے نیچے انگلی کے پس جانے کا واقعہ سناتے ہوئے گاؤں کے غریب اور سادہ لوگوں کی عظمت کی تعریف کی اور وہاں کی عورتوں کی محبت اور اخلاص کی تعریف بھی کی اور بتایا کہ زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ بادشاہ لوگ کیوں بادشاہ ہوتے ہیں اور بادشاہ لوگ کیوں سادہ مزاج اور غریب، محبت و پیار بانٹنے والے انسانوں کو عوام بنا دیتے ہیں۔ اسی پس منظر میں فیض صاحب لکھتے ہیں کہ مجھے اپنے باپ کی خان بہادری حقیر محسوس ہونے لگی وہ مزید لکھتے ہیں کہ مجھے عوام اچھے لگنے لگے۔ پھر گاؤں میں پھوپھیوں اور دیگر خواتین کے محبت بھرے سلوک نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ ہم کہنے لگے کہ عورتیں ہمیں ہر شکل میں اچھی لگتی ہیں۔ گاؤں میں چکی چلانے کے دوران ہاتھ زخمی ہوگیا تو اس بات کو چھپانے کے لیے فیض صاحب نے زخم کو چھپایا اور درد کو برداشت کیا۔ بڑے بھائی کے ساتھ میٹنگ کر کے فیصلہ کیا کہ یہ بات کسی کو نہ بتائی جائے خاص طور پر خان بہادر کو، فیض صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ابتدا تھی خان بہادر کے خوف کی، اجتماعی فیصلے کرنے کی، فیصلوں کو خفیہ رکھنے کی، ان میں احتیاط برتنے کی اور درد کو پی جانے کی تربیت فیض صاحب کو بچپن میں دی گئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اردگرد کے ماحول سے واقف ہوتے گئے۔

پھر ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے ان کے والد کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کیا کرتے تھے۔ کس طرح سے اپنی زندگی بسر کی اور دوسرا سوال یہ کیا کہ آپ کے والد علامہ اقبال کو جانتے تھے اور آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلے کے لیے گئے تھے تو فیض صاحب نے بتایا جی میں ملا تھا۔ دراصل ایوب مرزا کو اس بات کا تجسس تھا کہ فیض صاحب کے والد اور علامہ اقبال کی ملاقات کیوں ہوئی دونوں میں دوستی کیسے استوار ہوئی؟ فیض صاحب اس بات کا یوں جواب دیتے ہیں کہ میرے والد اور علامہ اقبال کی ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ چونکہ فیض صاحب کے والد ایک کامیاب ترین خود ساختہ انسانوں میں سے تھے۔ جنھوں نے زندگی کا کٹھن ترین سفر طے کیا۔ فیض صاحب نے بتایا کہ ان کے والد کا اصل نام سلطان

بخش تھا۔ جو بعد میں سلطان محمد خان کے نام سے مشہور و معروف ہوئے تھے۔ سیالکوٹ کی ایک تحصیل نارووال کے علاقے میں ایک چھوٹا سا گاؤں جہاں کالا اور قادر رہتے تھے، یہ گاؤں انہیں کے نام سے منسوب ہو گیا تھا۔ فیض صاحب کے والد اسی گاؤں کے ایک غریب اور مفلس گھرانے کے فرزند تھے۔ جن کے والد صاحب زادہ خان جو ایک معمولی سے کسان ہیں اس قابل نہیں تھے کہ اپنے بیٹے کو زیور تعلیم سے آراستہ کر سکتے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب کے والد کے متعلق ''فیض نامہ ''میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ یہاں ان کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا ذکر کروں گی۔ سلطان محمد خاں آہستہ آہستہ اپنے اندر علم کی اشتہا کو نجھانے میں کامیاب ہو گئے۔ یوں ان کے گھریلو حالات بھی اچھی طرح چلتے رہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کے والد صبح سویرے اٹھ کر گاؤں کے مویشی جمع کرتے اور انھیں کسی کھیت میں چرتا چھوڑ کر خود سکول میں پڑھنے لگے اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر پرائمری کا امتحان دیا اور جب نتیجہ آیا تو استاد نے بلا کر بتایا کہ میں اول آیا ہوں اور وظیفہ بھی

ملا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ اس زمانے میں کتنا وظیفہ ملا کرتا تھا فیض صاحب نے جواب دیا کہ یہی کوئی دو روپے گاؤں والے بھی دو روپے کے برابر مہینے کا گندم دیتے تھے۔ اب ان کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ گاؤں کے آس پاس کوئی مڈل سکول نہیں تھا اگر وہ شہر پڑھنے جاتے تو گاؤں کے مویشی نہیں چرا سکتے تھے۔ فیض صاحب بتاتے ہیں کہ ہمارے والد صاحب نے اپنے والد کو بتایا کہ انہیں دو روپے بطور وظیفہ بھی ملیں گے جو آپ کو خرچ کے لیے دیں گے۔ اسی طرح انہیں مڈل سکول جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کی تائید ڈاکٹر ایوب مرزا ''فیض نامہ'' میں بھی کرتے ہیں۔

آخر کار انہوں نے مڈل سکول کا امتحان بھی پاس کر لیا یہاں پر بھی امتیازی نمبروں سے پاس ہوئے۔ اب مسئلہ یہ تھا آس پاس کوئی ہائی سکول نہیں تھا پھر وہ پریشان ہو گئے۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ موچی دروازہ لاہور میں ایک ہائی سکول ہے وہ وہاں داخلہ لینے کے لیے چلے گئے یہاں پر چینیوں والی مسجد کے حجرے میں طلباء اور مساکین کو رہائش اور روٹی مفت مل جاتی

تھی۔سلطان محمد خاں نماز روزہ کے پابند تھے تلاوت بھی بڑی مہارت سے کرتے تھے سارا محلّہ ان سے بہت خوش تھا۔

فیض صاحب کہتے ہیں کہ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ دن کو سکول جاتے، دوپہر اور شام کو مسجد کا کام کرتے اور رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر ریلوے اسٹیشن چلے جاتے دیر تک قلی گیری کرتے رہتے۔اسی طرح کچھ رقم بچا کر اپنے گھر والوں کو بھیج دیتے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ایک دن مسجد میں افغانستان کا کونسلر نماز پڑھنے کے لیے آیا وہ سلطان محمد خان کی فارسی اور انگریزی زبانوں پر مہارت رکھنے پر بے حد خوش ہوا یہ کونسلر سرہند شریف والوں کا بہت معتقد تھا اور وہ کئی بار سلطان محمد خاں کو سرہند شریف اپنے ساتھ بھی لے گیا۔یہیں ایک بار عشاء کی نماز ادا کرتے ہوئے بے ہوشی کے عالم میں سلطان محمد خاں نے خواب دیکھا کہ سرہند اسے افغانستان کا وزیر بننے کی خوشخبری دے رہے ہیں اور جب کونسلر صاحب واپس گئے تو سلطان محمد خاں کو اپنے ساتھ افغانستان لے گئے، جہاں پر ان کی ملاقات والئی افغانستان امیر عبدالرحمٰن سے کرائی گئی اور انھیں دربار میں مترجم کی نوکری مل گئی بلکہ دربار کا میر منشی بھی بنا دیا گیا وقت کے ساتھ ساتھ ان کی قسمت بھی بلند ہوگئی۔

فیض صاحب نے اپنے والد کی افغانستان میں ملازمت کے متعلق کہا کہ والئی افغانستان کو ایک اچھے ترجمان کی ضرورت تھی کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ اور افغانستان کے درمیان ''ڈیورنڈ لائن'' کے بارے معاملات طے پا رہے تھے چنانچہ افغان حکومت نے ان کے والد سے پوچھا کہ کیا وہ افغانستان جانا چاہیں گے تو انہوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں مجھے اور کیا چاہیے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ امیر عبدالرحمٰن کے دربار میں آپ کے والد تنہا غیر افغانی تھے کیا، انہوں نے کہا کہ وہاں ایک انگریز خاتون جس کا نام ڈاکٹر لیلیز ہیملٹن بھی تھیں وہ ہمارے والد کی بڑی طرفدار تھیں انہوں نے کہا کہ وقت کا کچھ پتہ نہیں کہ ہمیں یہاں سے نکالا جائے اس لیے مستقبل کی فکر کرو۔سلطان محمد خاں نے اپنی جمع پونجی ڈاکٹر لیلیز کے نام لندن کے ایک بنک میں جمع کروادی۔

فیض صاحب نے بتایا کہ جب ہمارے والد افغانستان گئے تو اپنے ساتھ گاؤں کا ایک آدمی جو کہ چوکیدار تھا لے گئے، اس کا نام امام بخش تھا وہ ان کا بہت ہمدرد تھا ایک دن انہوں نے امام بخش سے مشورہ کیا کہ سازشیں ہمارے خلاف تیز ہوتی جا رہی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے واپس چلے جائیں ایک رات انہوں نے کابل سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا ہندوستان پہنچ کر انہوں نے لاہور میں پناہ لی اور جب لاہور میں انگریزوں کو معلوم پڑا کہ خان بہادر بغیر کسی اطلاع کے لاہور آ گئے ہیں تو انہیں ہندوستان کا جاسوس سمجھ کر جیل میں بند کر دیا۔ امیر عبدالرحمٰن حیران تھے کہ سلطان محمد خان نے یہ کیا کیا اور وہ افغانستان آ گئے۔ بقول ڈاکٹر ایوب مرزا:

''میں نے فیض صاحب سے کہا وہ بھی لاہور قلعہ میں تھے۔ کہنے لگے ہاں۔ میں نے کہا پھر تو آپ کا لاہور قلعہ پر پرانا کلیم ہے۔ کہنے لگے بھئی واقعی سرکار کو اب لاہور ہمیں الاٹ کر دینا چاہیے''[۲]

کیونکہ جب فیض صاحب کہ ایوب خان کے مارشل لاء میں گرفتار کیا گیا تھا انہیں بھی شاہی قلعہ میں رکھا گیا تھا۔ اس لیے شاہی قلعہ پر ان کا حق بنتا ہے۔ پھر فیض صاحب نے انہیں بتایا کہ ہمارے والد نے جیل میں کسی نہ کسی طرح لندن میں ڈاکٹر لیلیز ہیملٹن سے رابطہ کیا اس خاتون نے لندن میں ایسی چابی گھمائی کہ ہمارے والد صاحب رہا کر دیے گئے اور وہ لندن چلے گئے انہوں نے اپنی جمع شدہ رقم سے بیرسٹری کے لیے داخلہ لیا اور ادھر امیر افغانستان کو جب ان کے لندن میں قیام میں قیام پذیر ہونے کے بارے میں علم ہوا تو انہوں نے سفیر کے عہدے کی آفر کی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ چونکہ اس زمانے میں علامہ اقبال، سر عبدالقادر، سر فضل حسین، سر شفیع وغیرہ بھی لندن میں وکالت کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ سب لوگ تو طالب علم تھے مگر ہمارے والد صاحب کے ٹھاٹھ ہی نرالے تھے روپے پیسے کی کمی نہ تھی اور افغان حکومت سے تنخواہ بھی آتی تھی۔ وہ امراء کی سوسائٹی میں اثر رسوخ رکھتے تھے اور ڈیوک آف ونڈسر جو کہ بعد میں ایڈورڈ ہفتم

کہلائے، اسکے ساتھ پولو بھی کھیلتے تھے۔اس کی تائید ڈاکٹر ایوب مرزا" فیض نامہ "میں بھی کرتے ہیں۔

بقول ایوب مرزا:

''آپ کے والد واقعی بہت اولوالعزم اور من چلے تھے۔کالا قادر گاؤں کا گڈریا لڑکا پاؤں سے ننگا، تہبند پوش اور لندن میں بیرسٹری اور اس زمانے میں ڈیوک آف ونڈسر کے ساتھ پولو''[۳]

فیض صاحب نے جس طرح اپنے والد کی زندگی کے بارے میں بتایا ہے اگر انہیں بیسویں صدی کا ایک مہم جو قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔سلطان محمد خاں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وطن واپس آ کر جہلم میں قیام کیا ۔لیکن اس زمانے میں جہلم اتنا بڑا شہر نہیں تھا جہاں وہ وکالت کرتے اس لیے وہ سیدھے سیالکوٹ آ گئے۔

ڈاکٹر صلاح الدین حیدر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ سیالکوٹ میں قیام کے دوران ''کالا قادر'' سے تقریباً تین میل فاصلے پر جسٹر نامی گاؤں کے چودھری عدالت خاں کی بیٹی غلام فاطمہ سے ان کی شادی ہوئی۔اس سے قبل افغانستان میں تیرہ سال قیام کے دوران ان کی شادی امیر عبدالرحمٰن کی بھتیجی سائر جان سے ہوئی، جو کہ سردار محمد رفیع خاں کی بیٹی تھی۔مگر شادی کے دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔فیض صاحب لکھتے ہیں کہ افغانستان میں قبائل کی جنگوں کے دوران عورتوں کو پکڑ لیا جاتا تھا تو پھر انہیں مال غنیمت کے طور پر تقسیم کیا جاتا تھا۔اسی طرح چودھری سلطان کے کو تین یا چار خواتین ملیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے چودھری سلطان محمد خاں کی افغانی بیوی کا نام ''فیض نامہ'' میں ''سائر جان'' امیر عبدالرحمٰن کی بھتیجی اور ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں ساحر جان امیر عبدالرحمٰن کی بھانجی بتایا ہے جبکہ اصل نام ''سائر جان'' ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے بتایا کہ ان کے والد شہر کے جاگیردار بن گئے تھے۔انہوں نے بہت سی جائیداد سیالکوٹ اور موچی دروازہ میں خریدی۔وہ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے راقم نے فیض

صاحب سے پوچھ لیا کہ ان کے والد نے لاہور میں پریکٹس کیوں نہیں کی جبکہ ان کے سارے دوست احباب تو لاہور میں تھے تو فیض صاحب نے بتایا کہ انہیں اپنے علاقے اور اس کے لوگوں سے پیار تھا اور وہیں رہنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے سوال کیا کہ سیالکوٹ کی مٹی کتنی زرخیز ہے؟ اس نے سلطان محمد خاں اور علامہ اقبال جیسی شخصیات کو جنم دیا۔ تو فیض صاحب نے کہا وہاں اور بھی سماجی شخصیت، جس کا نام محمد بخش تھا اس کی شہرت ممّوں جوار یا کے نام سے تھی۔ وہ کچھ عجیب قسم کی چیز تھی جو اوہ کرتا تھا، اسمگلنگ وہ کرتا تھا لیکن فلاحی و سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ پھر اس کے بعد ہمارے استاد مولوی ابراہیم تھے۔ انہوں نے داڑھی رکھی، امامت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ درس و تدریس کے شعبے سے منسلک تھے۔ ان کی کلاس عجیب نوعیت کی ہوتی تھی۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ میں اردو قاعدہ پڑھنے ان کے پاس مسجد میں گیا بیک وقت وہ مختلف کلاسوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی، بڑی بارعب شخصیت تھی ان کی۔ بھئی ہم ان سے سات سال مسلسل قرآن پاک کا باترجمہ درس لیا ہے۔ پھر فیض صاحب علامہ اقبال کے استاد میر حسن کا ذکر کرتے ہیں ان کا مدرسہ شہر کے دوسرے علاقے میں تھا۔ ایک اور شخصیت بابا کھڑک سنگھ اکالی تحریک کے وہ بانی تھے۔

بقول فیض:

''اس دور میں گوردوارے انگریزوں کے قبضے میں تھے۔ اور ان کے انتظام کے لیے مہتمم وغیرہ انگریز بہادر خود مقرر کیا کرتے تھے۔ بابا کھڑک سنگھ نے گوردواروں کو واگذار کرنے کے لیے تحریک چلائی''[۲۹]

چونکہ یہ ایک خالص Anti-Imperialist تحریک تھی بعد میں ان لوگوں نے تحریک خلافت کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف محاذ بنالیا۔ جس میں کانگریس بھی برابر شریک تھی۔ بابا کھڑک سنگھ سکھ نیشنلزم کے ہیرو ہیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب کے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ بڑے رعب دار آدمی تھے۔ایک دفعہ میراثی عید قرباں پر بکرے ذبح کرنے دیر سے پہنچا تو والد صاحب اس قدر زور سے بولے کہ دیر کیوں لگا دی۔میراثی خوف زدہ ہو کر دھڑام سے نیچے گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ان کا دبدبہ اتنا تھا کہ کسی کو ان کے آگے بولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور وہ اپنی ذہانت و فطانت اور گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ سب پر چھا جاتے تھے۔

فیض صاحب نے بتایا میں ابھی کالج میں تھا جب ابا کا انتقال ہوا۔اب فیض صاحب کو معلوم ہوا کہ ان کے والد ۸۰ ہزار کے مقروض تھے۔کیونکہ وہ جتنا کماتے اس سے بڑھ کر خرچ کرتے۔شیر محمد حمید اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ سلطان محمد خاں نے سرگودھا میں پانچ مربع اراضی حاصل کی، عظیم الشان بنگلہ بنوایا اور اتنا زیادہ کاروبار شروع کر دیا کہ اس پر نگرانی کرنا مشکل ہو گیا۔سرمایہ بھی اتنا زیادہ لگا کہ بھاری قرض کے بوجھ تلے دب گئے۔مگر انہیں اطمینان تھا کہ وکالت کی پریکٹس کے ذریعے چند ماہ میں قرض اتار دیا جائے گا۔فیض صاحب نے ایوب مرزا کو بتایا کہ انہوں نے سارا قرض اتار دیا تھا ۔بقول فیض صاحب:

> ''ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ قرض کیسے اترے گا۔لوگوں نے کہا بھئی قرض کون اتارتا ہے۔مگر طفیل بھائی نے کہا یہ نہیں ہو سکتا اور پھر جائیداد بکنی شروع ہوئی اور قرض اترنا شروع ہوا۔بالآخر قرض اتر گیا اور ہم مفلسی کے دور میں داخل ہو گئے''۔۵

یہ تھی فیض صاحب کی ابتدائی زندگی۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے اس وقت برطانوی فوج میں ملازمت اختیار کی جب وہ کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھ چکے تھے۔ایک طرف وہ اس دور میں رومانوی شاعری کر رہے تھے اور دوسری طرف ان کے دل میں سامراج دشمن جذبات بھرے ہوئے تھے۔۱۹۳۵ء میں جب فیض صاحب نے امرتسر کے کالج میں بطور لیکچرار انگریزی ادب پڑھانا شروع کیا تو ان کی ملاقات رشیدہ جہاں سے ہوئی وہ ان کے غم کی وجہ

جان گئیں اور فیض صاحب کو مارکس/اینگلز کا کمیونسٹ مینی فیسٹو دیا۔ فیض صاحب نے اسے بغور مطالعہ کیا اور اس پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس کی تائید ڈاکٹر ایوب مرزا فیض نامہ میں بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کی رائے تھی کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد برصغیر میں مڈل کلاس طبقہ کے لیے تقریباً خوشحالی کا زمانہ تھا پھر ادب و شاعری میں رومانوی تحریک ابھری۔ فیض صاحب کا خیال ہے کہ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کے ادوار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ ''نقش فریادی'' کے ابتدائی حصے میں غنائی شاعری شامل ہے اور اس کا جواز یہ دیتے ہیں کہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۴ء تک طالب علمی کا زمانہ ہے اس میں تحریر کی گئی۔ اصل میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے اور دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک کا دور عالمی سطح پر جمہوری، انقلابی اور فاشسٹ، استعماری طاقتوں کی شدید لپیٹ میں تھا۔ یہ ایک کشمکش کا دور تھا۔ پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ اور معاہدہ وارسائی کے بعد ایک نئی جنگ کی تیاریاں زور پکڑنے لگیں۔ پہلی جنگ عظیم کے اثرات سے عالمی سطح پر مارکیٹوں کا نظام الٹ پلٹ گیا، اور امریکہ، یورپ میں بے روزگاری بڑھی۔ وہاں پر قومی زندگی کو بحال کرنے کے لیے کئی ملکوں میں فاشسٹ تحریکیں بھی قدم جمانے لگیں لیکن ان کے مقابلے میں جمہوری اور انقلابی قوتوں نے بھی یورپ میں پروان چڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود معاہدہ وارسائی کے بعد عالمی امن کے قیام کے لیے لیگ آف نیشنز کا قیام عمل میں لایا گیا لیکن عملی طور پر یہ ادارہ فعال نہیں تھا۔ ۱۹۴۰ء تک برطانیہ اور فرانس اس کے ممبر تھے جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیادیں مضبوط ہونے کے باوجود قومی برتری اور نسل پرستی کے حوالے سے ہٹلر کی نیشنل پارٹی نے برتری حاصل کر لی اور نوآبادیاتی نظام سے لوٹی ہوئی دولت کا غرور اور جبر اپنی انتہائی شکلوں میں فسطائیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جرمنی میں کمیونسٹوں کو نیچا دکھانے کے لیے ہٹلر نے کئی حربے آزمائے جن کا ذکر اس نے اپنی کتاب ''میری جدوجہد'' میں بھی کیا ہے۔ اٹلی میں مسولینی کی قیادت میں قدیم رومن امپائر کی بحالی کے خواب نے فاشسٹ طرز کا عمل اختیار کیا۔ کمزور لوگوں اور قوموں کو شکست دینے کی ٹھان لی۔ ۱۹۲۴ء میں

ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہوا۔جس کا اثر برصغیر کے متوسط گھرانوں کی جذباتی، سیاسی تعلق داری پر بھی پڑا۔اور ۱۹۳۴ء ارسطوریہ میں کان کنوں کے احتجاج پر ظالمانہ قتل ہوا۔اس کی ذمہ داری جنرل فرانکو پر تھی۔فرانکو کو جلاوطن کر دیا لیکن الیکشن کے بعد چند دوسرے جنرلوں کے ساتھ مراکشی فوجوں کی مدد سے اس نے قبضہ حاصل کر لیا اور ملک میں جمہوری اور فسطائی طاقتوں کی جنگ چھڑ گئی۔اس لڑائی میں چھ لاکھ افراد مارے گئے۔انگریزی ادب کا نقاد اور دانشور کرسٹوفر کاڈویل، مارکسی دانشور رالف فاکس، شاعر جان کانفورڈ اور بے شمار جمہوری قوتوں کے اتحادی دانشور اس جنگ میں استعمال ہوئے قوم پرست فاشسٹوں کو ہٹلر اور مسولینی کی حمایت حاصل رہی تھی۔ یہ ساری وجوہات تھیں ان کی روک تھام کے لیے فیض صاحب کو انگریز کی نوکری قبول کرنی پڑی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے فیض صاحب نے بتایا کہ ہم لوگ فاشزم کے خلاف تھے دنیا بھر کے ترقی پسندوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اس آواز میں عوام کی آواز بھی شامل ہوگئی۔روس بھی اتحادیوں کے برابر کھڑا ہوگیا۔یہی وہ وقت تھا جب سامراجیوں نے ترقی پسند اور بائیں بازو کے نظریات والے نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔مزید فیض صاحب بتاتے ہیں کہ میں اس وقت ہیلی کالج لاہور میں لیکچرار تھا اور مجید ملک مجھ سے پہلے فوج میں جا چکے تھے فیض صاحب جو فاشزم کے خلاف تھے کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور برطانوی فوج کے شعبہ تعلقات عامہ میں بحیثیت کپتان بھرتی ہوگئے۔وہ میجر اور کرنل کے عہدے تک پہنچے۔اس کی تصدیق ڈاکٹر ایوب مرزا ''فیض نامہ'' میں بھی کرتے ہیں۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فوجی ملازمت کے دوران خدمات مہیا کرنے پر فوج کی طرف سے MBE کا خطاب بھی ملا۔اس خطاب کے بارے میں ایک بار ڈاکٹر ایوب مرزا نے پوچھا:

''فیض صاحب یہ کیا فراڈ ہے۔کہنے لگے بھئی کونسا فراڈ؟ میں نے کہا یہ MBE کا فراڈ اور

پھر آپ لینن امن انعام یافتہ بھی ہیں۔یہ بات کہ یہ دونوں خطاب ایک ہی بشر پر نچھاور

کیے جائیں ہماری سمجھ سے باہر ہے۔انگریز جو سامراجی کیمپ کا اس وقت سرغنہ تھا۔وہ آپ کو MBE دے رہا ہے۔آپ کو یہ قبول کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی اور پھر اس کے بعد آپ لینن امن انعام بھی لے اڑے۔فیض بولے بھئی اس میں کوئی الجھن کی بات نہیں ہے۔ہم نے فوج اس لیے جائن [join] کی تھی کہ فاشزم کے خلاف سرگرم عمل ہوں۔لہذا وہاں ہم جو مشورے دیتے تھے وہ انگریز سرکار کو پسند آتے تھے اور وہ ان پر عمل کرتے تھیاس کے صلے میں انہوں نے کہا بھئی ہم تمھیں "MBE" دیتے ہیں ہم نے کہا دے دو۔ہم بہت خوش ہوئے۔ہم نے تو اسے فاشزم کے خلاف اپنی جدوجہد کی کامیابی تصور کیا'' ۶

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کے ذمے مختلف محاذوں پر ہندوستانی سپاہیوں کو اطلاعات بہم پہنچانے کا کام تھا۔فیض صاحب جب اپنی ملازمت کی ابتدا کرتے ہوئے محکمے کے انچارج کے سامنے پیش ہوئے تو فیض صاحب کی فوج میں ملازمت اختیار کرنے پر خوش نہیں تھا۔جب فیض صاحب کرنل بیئرڈ سے ملے تو انہوں نے بتایا کہ ایک خفیہ فائل میں ان کو ایک ایڈوانس کمیونسٹ ظاہر کیا گیا ہے جب فیض صاحب نے پوچھا کیا کوئی کرنل معذور بھی ہوتا ہے۔اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ترقی پسندوں کی جو بھی سرگرمیاں تھیں، ان کے بارے میں برطانوی حکمرانوں کے پاس معلومات تھیں لیکن اصل میں باہمی تعاون کی کی وجہ ''فاشزم'' کو خطرہ تھا۔بریگیڈیئر نے فیض صاحب سے ''کوئٹ انڈیا'' تحریک کے بارے میں پوچھا کہ کیا پالیسی اپنائی جائے تو فیض صاحب نے کہا کہ آپ کوئی لائن اختیار نہ کریں۔آپ اپنے وطن کو بچانے کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔فیض صاحب نے انہیں آگاہ کیا اگر جاپانی اور جرمن آ گئے تو وہ دو تین سو سال کے لیے غلام ہو کر رہ جائیں گے۔چنانچہ فیض نے آرمی کے ہر یونٹ میں ایک سیل بنانے کا مشورہ

دیا۔ جو یہ تعلیم دے کہ فاشزم کیا ہے، سو یہ تجویز وائسرائے اور کمانڈر انچیف تک پہنچی اور ''جوش گروپ'' کے نام سے یونٹ میں سرکل بنائے گئے اور فوج میں فیض صاحب نے تعلیم کا م بھی شروع کروادیا اور اسی کے نتیجے میں فیض صاحب کو'' آرڈر آف دا برٹش امپائر'' بھی ملا۔ لیکن ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ''کوئٹ انڈیا'' اور قومی تحریک آزادی کی مختلف شکلوں کے خلاف ترقی پسندوں کو ایک پالیسی کے تحت استعمال کیا جارہا تھا اور ان کو یہ خوش فہمی تھی کہ وہ جمہوری قوتوں کے لیے سرگرم عمل ہیں ترقی پسندوں کے پاس برٹش آرمی جوائن کرنے کا جواز رومانوی اور کمزور تھا فاشزم کے خلاف جنگ مظبوط اور مستحکم پوزیشن کے ساتھ نہیں لڑی جاسکتی تھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے اپنی برطانوی فوجی ملازمت کے دوران برطانوی حکمرانوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ سپاہیوں کو رجمنٹ کا جھنڈا اونچا رکھنے اور سرکاری نمک حلال بننے کی تلقین کرنے کی بجائے فسطائیت کی حقیقت سے آگاہی دیں فیض صاحب اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ کانگریس کے دو دھڑوں میں سے ایک مسلم ''عالمی فاشزم'' کو سپورٹ کر رہا تھا۔ اور اس کو گاندھی جی کی آشیرواد حاصل تھی اور دوسرا دھڑا ترقی پسند نظریات رکھتا تھا جو فاشزم کے خلاف تھا اس کی تائید ڈاکٹر ایوب مرزا ''فیض نامہ'' میں کرتے ہیں کہ انہیں انگریز اور دیسی افسروں کو ہندوستان اور کانگریس کے بارے میں لیکچر دینے کا کہا گیا چنانچہ انہوں نے پاکستان کے مطالبے کی بھی ترجمانی کی اور بتایا کہ مسلم لیگ برصغیر کے مسلمانوں کی ترجمان ہے۔ اس پر ایک انگریز بریگیڈیئر نے اٹھ کر سوال کیا کہ مسلم لیگ کا پاکستان کے بارے میں کیا رویہ ہے؟ فیض صاحب کی باتوں سے تو یہ لگتا ہے کہ برصغیر کی نمائندہ جماعت بہت سے مسائل میں گھری تھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے سوال کیا کہ آپ اپنی نوکری کے دوران کسی باشعور سیاسی فوجی سے ملے تو وہ بولے اس وقت فوج انگریز اور امریکی دانشوروں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر فیض صاحب کا رابطہ ترقی پسند دوست احباب اور کمیونسٹ پارٹی کے ارکان سے بھی رہا، لیکن کہیں کہیں پر فیض صاحب کے اپنے بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ

کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ طور پر ممبر نہیں رہے۔ مزید فیض صاحب بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ ان کی ملاقات وی۔ ڈی چوپڑا سے ہوئی۔ اسے باقاعدہ گپ شپ کے لیے مناسب جگہ درکار تھی۔ تاہم ان کے کہنے پر فیض صاحب اپنے گھر میں میٹنگوں کے لیے سہولت فراہم کر دی۔ یہ بات ڈپٹی کمشنر تک پہنچی۔ وی ڈی چوپڑا کو گرفتار کرا کے جیل بھجوا دیا گیا حالات کی پیچیدگی کے باعث فیض صاحب اپنے انگریز بریگیڈیئر کے پاس چلے گئے اور ڈی سی کے خلاف واویلا مچا دیا کہ وہ کون ہوتا ہے ہم پر پہرہ لگوانے والا اور اس کے بعد فیض صاحب نے کامریڈوں کی میٹنگ اپنے گھر نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ جنگ کے خاتمے پر جب جاپانی اور آئی این اے کے قیدی آئے تو فیض صاحب کے محکمے سے بھی ان کے بارے میں رائے معلوم کی۔ اس زمانے میں نیوی میں بغاوت کھڑی ہو چکی تھی اور انگریزوں کا مطالبہ تھا کہ ان لوگوں کا کورٹ مارشل کیا جائے اور انگریزوں کے خلاف غیر سیاسی لوگوں کو بھی سزائیں دی جائیں۔ بقول ایوب مرزا:

> ''ان مسائل سے نمٹنے کے لیے ایک نیا محکمہ "انٹر سروسز مورل ڈائریکٹوریٹ" کے نام سے مقرر کیا گیا۔ جو براہ راست کمانڈر انچیف کے ماتحت تھا۔ ہم اور کرنل حق نواز جو بعد میں جرنل ہوئے اس محکمے کے نائب سربراہ اور مشیر ٹھہرے''[۷]

کرنل حق نواز نے ان باغیوں کے حق میں دلائل بھی دیئے لیکن فیض ان لیڈروں کو نظر انداز کرنا چاہتے تھے۔ جو ایک طرف مشترکہ فاشزم کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے اور دوسری طرف انڈین نیشنل آرمی کے لوگوں کے لیے جلوس بھی نکالتے تھے۔ ایوب مرزا سے بات کرتے ہوئے فیض صاحب نے بتایا کہ ہم انگریزوں کی طوطا چشمی پر بھونچکے رہ گئے کیونکہ:

اول: جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی امریکہ سے مل کر شمالی خطرے یعنی روس سے جنگ کی پیش

بندیاں کرر ہے تھے۔

دوم: انہیں خودمختار پاکستان کا وجود ہرگز پسند نہ تھا۔

سوم: ہندوستان کی آزادی یا تقسیم کی صورت میں فوج کی ہائی کمان انگریزوں کے پاس رہے گی ہرگز تقسیم نہیں ہوگی۔

یہ وہ ساری برطانوی خفیہ پالیسیاں تھیں اور حالات کے رخ بھی بدل رہے تھے۔جن کی وجہ سے فیض صاحب کہتے ہیں کہ اب فوج سے کوچ کرنے کا وقت آ گیا اور وہ فوج کی ملازمت چھوڑ کر چلے گئے جنگ کے خاتمے پر فیض کرنل کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو فوج سے مستعفی ہو گئے اور ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ انہوں نے واپس محکمہ تعلیم میں جانا چاہا۔اس سلسلے میں وہ گورنمنٹ کالج کے سابق پروفیسر چیٹر جی سے ملے جو محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر تھے۔ان سے کہا اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور ہمیں ہماری استادی لوٹا دو۔اس کی تائید میں احمد سلیم اپنی کتاب لکھتے ہیں کہ:

''ہم نے کہا کہ جنگ ختم ہوگئی ہے۔اب ہم واپس آنا چاہتے ہیں ،اب ہماری استادی لوٹا دو۔چیٹر جی بہت حیراں ہوئے ، کہنے لگے، بھائی فیض !فوج سے باہر آ کر کیا کرو گے؟تمہیں تنخواہ کتنی ملتی ہے۔دو ہزار پانچ سو روپے۔ چیٹر جی اٹھ کھڑے ہوئے ، کہنے لگے، بھائی اتنی تنخواہ تمہیں فوج سے باہر کہاں ملے گی؟ مجھے نہیں ملتی۔مل سکتی ہی نہیں ۔۔۔۔۔۔ہم نے چیٹر جی کو بہت سمجھایا کہ ہمیں ڈھائی سو روپے ماہانہ مل جائیں تو تقدیر سنور جائے۔چیٹر جی عجیب انداز سے منہ دیکھ رہے تھے۔کافی لمبے سکتے کے بعد فرمانے لگے، بھائی اگر تم نے یہی ٹھانی ہے اور تمہارا مقدر چکر میں ہے تو پھر آ جاؤ۔لیکچرار کی highest pay ساڑھے تین سو

روپے ہے''۸

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ابھی فیض صاحب نے دوبارہ کالج جوائن نہیں کیا تھا۔ میاں افتخار الدین آئے کہنے لگے۔ ہم لاہور سے ''پاکستان ٹائمز'' کے نام سے انگریزی اخبار نکال رہے ہیں اور تمہارا نام چیف ایڈیٹری کے لیے سلیکٹ کرلیا ہے۔ میں نے کہا میاں صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں نے کبھی جرنل ازم میں قدم نہیں رکھا اور اتنا بڑا اخبار کیسے چلا سکتا ہوں۔ کیونکہ فیض صاحب کے لیے پاکستان ٹائمز کی ادارت ایک اچانک خبر کے طور پر سامنے آئی۔ جس کے لیے وہ خود تیار نہیں تھے۔ بقول ایوب مرزا:

> ''میاں صاحب ناراض ہوئے، کہنے لگے: میں کوئی بے وقوف ہوں تم نے مجھے جاہل سمجھا ہے جو تمہارا نام تجویز کر آیا ہوں۔ اور اگر نا تجربہ کاری دلیل ہے تو فوج کا تجربہ تمہیں کہاں تھا۔ بس اب فوج سے ریلیز کے لیے درخواست بھیج دو۔ دو ماہ میں پرچہ سڑکوں پر ہونا چاہیے۔''۹

ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے فوج سے ریلیز کے لیے درخواست بھیج دی، وہ منظور بھی ہوگئی اور ادھر میاں صاحب واپس نہ آئے۔ انہی دنوں کانگریس کی مخلوط حکومت بنی تھی۔ محکمہ خارجہ ابھی بنا تھا لیکن کچھ ہندوستانی پہلی بار فارن سروس میں لیے جا رہے تھے سردار پٹیل کے پاس محکمہ داخلی امور تھا۔ ان کے ڈپٹی سیکرٹری میاں عظیم حسین، فیض صاحب کے دوست تھے اور ان کی خواہش تھی کہ فیض صاحب بھی یہاں آجائیں ملازمت کرنے کے لیے۔ اب فیض صاحب نے فوج سے ریلیز بھی لے لی اور میاں صاحب بھی واپس نہ آئے اور سردار پٹیل کے پاس بھی نہ جا سکے پھر فیض صاحب نے فوج میں چھ ماہ کی توسیع لے لی۔ ایک دن اچانک میاں صاحب آئے اور کہنے لگے لاہور چلو اور پرچہ نکالو اور کہنے لگے میں تمہیں صرف ۱۰۰۰/- روپے ماہانہ دوں گا اور تمہیں رہنے کے لیے مکان بھی چاہیے ہوگا اور ہم نے کہا فوج میں

چھ ماہ کی extension بھی لے لی ہے۔ کہنے لگے اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ فیض صاحب بتاتے ہیں کہ ہم بیوی بچوں کو دلی چھوڑ کر ایک نئی منزل کی طرف چل پڑے۔۔ میاں صاحب کا مکان رہنے کے قابل نہیں تھا اور ہم کسی دوست کے فلیٹ میں ٹھہر گئے۔ مزید فیض صاحب بتاتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کا فسادات کا زمانہ تھا۔ ہم رات کے دو بجے اخبار کے دفتر سے پیدل گھر جا رہے ہوتے تھے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا انٹرویو کے دوران فیض صاحب سے ملانا چراغ حسن حسرت کے متعلق پوچھا وہ کیسے انسان تھے؟ فیض صاحب نے بتایا کہ بھی مولانا ایک باغ و بہار شخصیت تھے آدھی سے زیادہ زندگی امنگ میں گزاری اور باقی زندگی جنگ میں گزار دی پھر ایوب مرزا نے فیض صاحب سوال کیا کہ آپ مولانا کو فوج میں لائے تھے۔ کہنے لگے ہاں بھئی ہم انہیں فوج میں لے گئے تھے مولانا انٹرویو کے لیے دلی آئے انٹرویو کے بعد ہمارا بریگیڈیئر ہم سے کہنے لگا یہ فوج کے لیے کیا کام کرے گا تم کہتا ہے کہ یہ قابل آدمی ہے لیکن مجھے تو نہیں لگتا۔ میں نے بریگیڈیئر سے یہ کہا یوں سمجھ لو جیسے تم ''لندن ٹائمز'' سے ملاقات کر رہے ہو۔ مجید ملک اس وقت فوج میں سینئر تھے اور اس کے بعد ہم تھے۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کو سنگاپور بھیج دیا گیا اور ہمیں جب علم ہوا تو بہت پریشان ہوئے وہ اپنی عادات کی وجہ سے وہاں نہ چل سکیں گے آخر وہی ہوا۔ ان پر charges لگے۔ اور ایک انکوائری کمیٹی بھی بٹھائی گئی اور جواب طلبی کے لیے دلی بلائے گئے۔ میں نے پوچھا مولانا نے ایسا کیا کر دیا تھا تو کہنے لگے ان کی عادت تھی دفتر لیٹ پہنچنا، وردی ڈھیلی ڈھالی پہنے چلے جاتے ہوں گے کبھی ایک جوتے کے تسمے بندھے ہیں تو دوسرے کے کھلے ہیں اب یہ فوجی نوکری میں ایسا کہاں ہوتا ہے۔ وہاں پر ڈسپلن قائم رکھنا پڑتا ہے۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ ہم بریگیڈیئر کے پاس گئے تو اسے بہت سنائیں اور ہم نے مولانا کی صفائی پیش کی تو وہ منظور ہو گئی اور اس دوران مجید ملک سرکاری دورے پر دہلی آئے اور یہ معاملہ انہیں سونپا گیا۔ یوں تو مولانا کو اس معاملہ سے آزادی مل گئی تھی مگر وہ اصرار کر رہے تھے کہ کسی صورت بھی سنگاپور نہیں جانا اور ہمیں فوج سے نکلواؤ۔ ہم نے انہیں سمجھایا یہ کام

ہمارے بس کا نہیں ہے مجید ملک ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ بات یہاں تک آ پہنچی انھوں نے مجید ملک کے نام فارسی میں اسی مضمون کی حیثیت سے ایک قصیدہ لکھا۔ پھر ان کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔ مزید فیض صاحب بتاتے ہیں کہ جب ہم فوج چھوڑ کر پاکستان ٹائمز میں آئے امروز نکالنے کا پروگرام بنا تو اس وقت مولانا لاہور میں تھے۔ ہم نے بلایا اور وہ چلے آئے اور امروز سنبھال لیا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا میاں افتخار الدین امروز کو چلانے کے لیے مولانا کو کہاں سے لائے تھے فیض صاحب بولے بھئی یہ انتخاب ہمارا تھا انہیں ہم لائے تھے کیونکہ ان دنوں پاکستان ٹائمز کا اجراء ہو چکا تھا اور ہم اس کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ پھر ہم مولانا صاحب کو امروز کے لیے لائے تھے۔ اب مولانا امروز کے ایڈیٹر تھے فیض صاحب مولانا کے متعلق بتاتے ہیں کہ وہ میدان صحافت میں اہم مقام رکھتے تھے۔ امروز کو جس قابلیت سے انہوں نے چلایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بقول فیض صاحب:

> ''مولانا حسرت موہانی کے مزاج میں انکسار تھا۔ اب ایسا آدمی کہاں سے ملے گا۔ جو اپنے فن میں ماہر بھی ہو، یکتائے روزگار بھی ہو، یار باش بھی ہو، اس میں انکسار بھی ہو، اور نگین مزاج بھی ہو اور جسے پیسے سے پیار بھی نہ ہو'' ۱۰

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ مولانا آپ کو بہت پسند کرتے تھے کیا؟ تو وہ بولے بھئی اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں مولانا کا درجہ علم و ادب اور صحافت میں میں بہت بلند ہے۔ اس لیے ہم ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ احمد سلیم بھی اس کی تائید میں لکھتے ہیں۔ جب ۱۹۴۸ء میں میاں افتخار الدین نے اردو روزنامہ امروز جاری کیا تو فیض صاحب اس کے بھی مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے لیکن اخبار کے معاملات چلانے کے لیے مولانا چراغ حسن حسرت کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ایک شام میں فیض صاحب کے ساتھ ان کے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں موجود

تھا۔تقریباً وہاں سوشلسٹ تحریک کے کافی دوست موجود تھے۔ پرانے سال کو خیر باد کہنے اور نئے سال کی آمد کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ پھر اسی شام ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کی بیٹی منیزہ ہاشمی کا فیض صاحب کے گھر انٹرویو لیا۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے میزو سے پہلا سوال کیا کہ تمہیں ابو کی کونسی پہلی بات یاد ہے۔وہ کہنے لگی جب ۱۹۵۱ء کی صبح میں جاگی تو گھر میں چاروں طرف سناٹا تھا ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ابو مجھے اپنے بستر میں نظر نہ آئے میں اس وقت بہت چھوٹی تھی امی سے ابو کا پوچھا کہ وہ کہاں گئے ہیں تو وہ بولی باہر گئے ہیں اور پھر تھوڑی دیر بعد میاں افتخار الدین آئے۔ پھر میری تائی سرور بیگم اور پھوپھیاں بالی اور مریم آ گئیں۔سب کے سب پریشان تھے میاں صاحب انہیں چپ کرا رہے تھے اور تسلی دے رہے تھے۔ یہ ہم سب کے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا پھر ڈاکٹر ایوب مرزا نے پوچھا کہ تمہیں ابو کے جیل جانے کے بعد گھر کے مالی حالات میں تنگی محسوس نہیں ہوئی تو وہ بولی مجھے اس چیز کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا کیونکہ امی نے گھر کا انتظام اچھے طریقے سے سنبھال لیا تھا مجھے صاف ایک بات سمجھ آتی تھی کہ ابو کو جیل جانے کی بجائے ہمارے پاس ہونا چاہیے تھا۔مزید میزو بتانے لگی کہ جب بھی ہم ابو سے جیل میں ملنے جاتے تو بڑے ٹھاٹھ سے جاتے تھے۔ملاقات کے خاتمے پر دل چاہتا تھا جیل کی لوہے کی سلاخوں کو توڑ کر یا تو ابو کو اپنے ساتھ لے جاؤں یا خود ان کے پاس جیل میں رہ جاؤں۔ میری آٹھویں سالگرہ پر انہوں نے مجھے جیل سے ایک خوبصورت نظم تحفے میں بھیجی جو مجھے بہت پسند آئی۔ پھر اس نے بتایا کہ ایک دفعہ کی بات ہے دسمبر کی پندرہ تاریخ تھی۔ میں اس وقت چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی ایک روز مجھے کلاس میں بلا کر بتایا گیا کہ میرے ابو گرفتار ہو گئے ہیں حالانکہ میں روئی نہیں لیکن میرے دل اور دماغ نے اس بات کو قبول نہیں کیا میں ایسا محسوس کرنے لگی جیسے میرے ابو دنیا کی کوئی اعلیٰ شے ہیں یا جاگیر دری قسم کی کوئی چیز پھر ابو جیل چلے گئے۔ بقول میزو:

''مجھے احساس ہو گیا کہ ابو میں کوئی خاص بات ہے جو سرکار انہیں پکڑ کر لے جاتی ہے۔اور میں ابو پر فخر کرنے لگی۔اب میں اپنی ہمجولیوں کو فخریہ انداز میں بتاتی تھی کہ

میرے ابو آج کل جیل میں ہیں''[۱۱]

اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے ایوب مرزا نے میزو سے سوال کیا کہ تمہیں کب معلوم ہوا کہ فیض صاحب بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ہی ایک صاحب نظر یہ انسان بھی ہیں وہ بولی ۱۹۶۲ء میں جب ابو کو لینن امن انعام ملا۔ اس کی خبر سب سے پہلے مصلح الدین نے دی۔ مجھے اس وقت سوشلزم کی سمجھ تو نہ آئی مگر اپنے ابو پر فخر ضرور محسوس کیا کہ ابو بہت بڑے انسان ہیں اسی سال انہیں دل کا دورہ بھی پڑا۔ ابو انعام وصول کرنے روس چلے گئے۔ اپنا علاج بھی کروایا پھر لندن چلے آئے اب لندن میں اچھی زندگی بسر ہو رہی تھی۔ ۱۹۶۴ء کی بات ہے میں نے ابو سے پوچھا آپ اتنے اداس کیوں رہتے ہیں تو وہ کہنے لگے میں واپس اپنے ملک جاؤں گا یہ کوئی رہنے کی جگہ ہے جبکہ میں واپس نہیں آنا چاہتی تھی۔ وہاں پر تعلیم حاصل کر رہی تھی پھر ایک دن میں نے ابو سے پوچھ لیا آپ کیوں وطن واپس جانا چاہتے ہیں تو وہ بولے میرا جینا مرنا وہیں پر ہے۔ ابھی تم چھوٹی ہو اور یہ بات نہیں سمجھ سکتی ہو۔ ایوب مرزا نے پھر سوال کیا کہ تم خود اعلیٰ درجے کی فنکارہ ہو اور تمہارا میاں بھی قابل اور پڑھا لکھا نوجوان ہے فیض تم دونوں کے لیے Handicape تو نہیں ہے میزو مسکراتے ہوئے بولی میں جہاں کہیں بھی جاتی ہوں لوگ مجھے فیض کی بیٹی کے نام سے پکارتے ہیں بعد میں میرا نام لیتے ہیں ایوب مرزا نے میزو سے آخری سوال کیا کہ تم نے اپنے ابو سے زندگی میں کیا سیکھا وہ بولی صبر کرنا اور پیار کرنا سیکھا ہے ابو پیار کا ایک سمندر ہیں۔ بقول میزو:

''دراصل میں ابو کے معاملے میں Emotional ہوں ان کے بغیر مجھے اپنا
گردوپیش پھیکا نظر آتا ہے۔ میری زندگی میں ان کا بڑا دخل ہے ابو صبر کی ختم نہ ہونے
والی ایک گہری کان ہیں''[۱۲]

وہ کہتے ہیں کہ جتنا لوگوں سے پیار کرو گے وہ اس سے بڑھ کے آپ کو پیار دیں گے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب سے انٹرویو کے دوران ایک دن مجھے بخاری صاحب کی میکسیکو کے نظام تعلیم کے بارے میں ایک رپورٹ

دی اور کہا کہ اسے پڑھ لو۔ بخاری صاحب نے اسے ۱۹۴۸ء میں تحریر کی تھی۔ پھر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ آپ کئی بار بخاری صاحب سے ملے ہوں گے وہ سوشلسٹ کیوں نہ ہوئے تو فیض صاحب نے جواب دیا کہ پطرس بخاری کو جنہیں ہم بخاری صاحب کہتے ہیں کچھ لوگ بڑے بخاری صاحب بھی کہتے تھے۔ ہم ان کے شاگرد تھے جب ہم ففتھ ایئر میں پہنچے ان کا بڑا رعب و دبدبہ ہوتا تھا کسی کی کیا مجال کوئی ان سے بغیر اجازت کے مل سکے پھر فیض صاحب بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنا ایک حلقہ بنا لیا تھا جس میں امتیاز علی تاج، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، صوفی تبسم، سالک صاحب، مولانا چراغ حسن حسرت، ابوالاثر حفیظ جالندھری، پنڈت ہری چند اور کچھ دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ ایسے سمجھ لیں دانش وروں کا ایک گروہ تھا، جن کی آپس میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں ان کی محفلیں صوفی صاحب یا پطرس بخاری کے گھر پر منعقد ہوا کرتی تھیں اس کی تائید ایوب مرزا "فیض نامہ" میں بھی کرتے ہیں پھر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے اگلا سوال کیا کہ یہ نیاز مندان لاہور کیا چیز تھی تو وہ بولے:

> ''بھئی انہیں بزرگوں نے لاہور میں اپنا ایک حلقہ بنا لیا تھا جسے نیاز مندان لاہور کہتے تھے۔ دراصل یہ جھگڑا بڑا پرانا ہے۔ یوپی والے پنجاب والوں کی اردو کے قائل نہیں تھے انہیں سے سوال و جواب میں نیاز مندان لاہور وجود میں آ گیا''[۱۳]

پھر فیض صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ایک عجیب سا منظر تھا۔ لاہور میں بہت پڑھے لکھے لوگ موجود تھے اور یوپی سے بھی بڑے بڑے نامور لوگ کچھ تھوڑے وقت کے لیے آئے اور کچھ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ ان میں یگانہ، جگر مرادآبادی، تاجور نجیب آبادی، جوش، سیماب اکبرآبادی وغیرہ ان بزرگوں نے کہا کہ ہم اہل زبان ہیں اور لاہور والوں نے کہنا شروع کر دیا ہم زبان دان ہیں۔ یوں لاہور میں اہل زبان اور زبان دان کے دو گروہ موجود تھے۔ پھر ایوب مرزا نے پوچھا اہل زبان کے سربراہ کون تھے فیض صاحب نے بتایا تاجور نجیب

آبادی اور زبان دان کے سربراہ محمد دین تاثیر تھے دونوں کو علم و ادب میں ایک مقام حاصل تھا اور جب ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا یہ لوگ لاہور کی طرف کیوں آئے تو وہ بولے بھئی ہمیں کیا معلوم، ہم تو طالب علم تھے یہ تو صوفی صاحب ہی بتا سکیں گے ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ اپنا گھر بار چار صورتوں میں چھوڑا جاتا ہے۔

۱: علم کی پیاس بجھانے کے لیے

۲: قحط کی صورت میں

۳: حملہ آوروں کے ڈر سے

۴: وبا کی صورت میں

چنانچہ فیض صاحب نے مزید بتایا کہ دونوں متحارب فریقوں کا میدان کارزار موچی دروازے کے باہر ایس پی ایس ہال میں ہوا تھا۔ فیض صاحب کے طالب علمی کے زمانہ طالب علمی میں دانش وروں کا ایک گروہ نیاز مندان لاہور جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس کی سرگرمیاں بہت عروج پر تھیں۔ یہ گروپ کسی تحریک سے تعلق نہیں رکھتا تھا اسی گروپ نے نئے نوجوان شاعروں جیسے فیض صاحب کی بھی بہت حوصلہ افزائی کی۔ پھر ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے مجلس امراء جس کی نشست بخاری صاحب کے گھر ہوتی تھی اس میں وہ تمام شاعر، ادیب اور صاحب علم لوگ شریک نہیں ہو سکتے تھے جن کی شاعری اور ادبی کارنامے ابھی پختگی کے مراحل سے نہیں گزرے ہوئے ہوتے۔ بھئی بخاری صاحب نے اپنے خاص دوستوں کے علاوہ اپنے اور محبت کرنے والوں کے درمیان ایک لمبی دیوار کھڑی کی ہوئی تھی کوئی بھی بغیر اجازت کے ان سے مل نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پوچھا کہ تاثیر صاحب جو مجلس امراء کے رکن تھے بقول ان کے وہ تو ایک سیدھے سادے انسان تھے۔ فیض صاحب نے جواب دیا کہ وہ بہت تیز آدمی تھے دوسروں کو لڑانے میں کافی مہارت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کے دوسرے استاد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم تھے۔ جن سے فیض صاحب کو بہت محبت تھی وہ بھی انہیں بہت پیار کرتے تھے پطرس بخاری کے بعد دوسری محفل صوفی تبسم کے گھر پر ہوتی تھی فیض صاحب، صوفی تبسم صاحب اور خاص طور پر اپنے طالب علمی کے زمانے کے حوالے سے ان کا ذکر بہت محبت اور احترام سے کرتے تھے ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

''صوفی تبسم کا گھر تو سب کے لیے صلائے عام تھا سبھی شام کو وہاں اکٹھے ہوتے تھے۔ حسرت صاحب بھی، حفیظ جالندھری بھی، لق لق بھی، تاثیر بھی، ہم بھی کبھی چلے جایا کرتے تھے صوفی صاحب کا گھر تو لنگر تھا سب وہاں آتے تھے اور باہر سے جو آیا وہ ہوٹل تھوڑا ہی جاتا تھا۔ اسٹیشن سے نکلے تانگہ پکڑا اور صوفی صاحب۔ بس سے اترے تانگہ پکڑا اور صوفی صاحب کے گھر۔''[۱۴]

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ پطرس بخاری کی Aristocratic مجلس کی نسبت اسے Plebian مجلس کہا جاتا تھا کیونکہ اس میں عوامی رنگ تھا۔ پھر میں نے فیض صاحب سے پوچھا کہ صوفی صاحب جیسا اتنا قابل استاد، عالم اور علم وفن میں کمال آدمی اپنے عروج تک نہ پہنچ سکے جہاں ان کا مقام ہے۔ فیض صاحب کہنے لگے یہ بات بھی ٹھیک ہے صوفی صاحب سے کم درجہ شاعر اور رائٹرز نے کہیں کہیں زیادہ شہرت حاصل کر لی ہے۔ شہرت حاصل کرنے کی خوبی ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی یہ ایک الگ فن ہے جس کا علم وفن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور صوفی صاحب اس فن سے نا آشنا تھے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ایک دن میں نے فیض صاحب سے پوچھ ڈالا کہ یہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کہاں چلی گئی وہ بولے ایک عرصے سے ہم اس سے الگ ہو گئے ہیں ایوب مرزا نے پوچھا کہ آپ اس میں شامل کب ہوئے تھے۔؟ بولے بھئی جس دن ترقی پسند مصنفین کو بنانے کا فیصلہ ہوا قصہ یوں تھا کہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں چند روشن خیال طلباء

آپس میں مل بیٹھے۔ سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور ڈاکٹر جیوتی گھوش وغیرہ۔ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ اس کا پہلا اجلاس لندن میں ہوا۔ لندن میں روشن خیال طلبا ایک منشور پر متفق ہو گئے تھے۔ ایک رپورٹ بھی تیار کر لی گئی تھی۔ مزید فیض صاحب بتاتے ہیں کہ اس مسودہ کی ایک صفحہ کی نقل محمود الظفر کو بھیجی۔ جسے ہم دونوں نے پڑھا اور اس پر اپنی رضامندی بھی ظاہر کی، طے یہ ہوا کہ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر لندن سے محمود الظفر سے ملاقات کے لیے امرتسر آئے اور یہاں پر ان کی ملاقات فیض صاحب سے بھی ہوئی۔ امرتسر میں فیض صاحب کی سجاد ظہیر سے ملاقات کے بعد یہ چار لوگ قافلہ کی صورت میں لاہور کے ادیبوں اور شاعروں سے رابطے کے لیے میاں افتخار الدین کے گھر پہنچے پہلی میٹنگ میاں صاحب کی کوٹھی پر ہوئی۔ جس میں بیس کے قریب لوگ ہوں گے۔ میاں بشیر احمد، مولانا چراغ حسن حسرت، وقار انبالوی، مولانا عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، فیروز دین منصور خاص طور پر ان لوگوں نے شرکت کی۔ یوں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام وجود میں آ گیا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا بولے اس دور میں دانش وروں کی منظم تحریک موجود نہ تھی پوری دنیا میں لکھنے والوں نے سپین میں فرانکو کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دی۔ بقول فیض:

> ''ہر چند کہ دانشور ملک کی زبوں حالی کا درد اپنے دلوں میں محسوس کرتے تھے، مگر اس کے اظہار کے لیے ملک گیر باضابطہ سمت نہ تھی۔ بیشتر دانشوروں میں ایک سا میلان اور کسک ہونے کے باوجود غنیم کی نشاندہی اور اس پر بھرپور حملے کا فقدان تھا'' ۱۵

مزید فیض صاحب بتاتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد دوسری دہائی میں جو فارغ البالی نے جنم لیا تھا۔ تیسری دہائی میں وہ ختم ہو چکی تھی تمام دنیا کو معاشی مسائل نے گھیر لیا تھا۔ ہندوستان اس کی لپیٹ میں تھا۔ روس کے علاوہ تمام دنیا

میں بیشتر نوجوان طبقہ اپنے حقوق کے لیے جنگ لڑ رہا تھا۔ان کے مسائل حل ہونے کی بجائے سنگین صورت اختیار کرتے جا رہے تھے اور ان لوگوں نے ان اقدار کے خلاف بغاوت شروع کر دی پھر یورپ میں ترقی پسند روشن خیال ادبی انجمنیں منظر عام پر آنا شروع ہو چکی تھیں۔

بین الاقوامی حالات میں بڑی بڑی تبدیلیاں اور الجھنیں پیدا ہو چکی تھیں۔ایک طرف فسطائیت کا بڑھتا ہوا سیلاب تھا تو دوسری طرف سامراجی ملکوں کا خونخوار استعماریت تھی۔ترقی مصنفین کی انجمن کا قیام وقت کی اہم ضرورت تھا یوں اس کے اغراض و مقاصد بھی طے ہو گئے تھے۔جس کی وضاحت ڈاکٹر ایوب مرزا نے "فیض نامہ" میں بھی کی ہے۔مزید فیض صاحب بتاتے ہیں کہ صوفی غلام مصطفےٰ اس کے سیکریٹری منتخب ہوئے اور ہم پنجاب انجمن کے سیکریٹری بن گئے اور یوں لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی پنجاب شاخ کا بیڑہ فیض صاحب نے اٹھایا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کب اور کہاں منعقد ہوئی؟ فیض صاحب بولے بھئی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنوء میں ہوئی۔منشی پریم چند نے اس کی صدارت کی انہوں نے عمدہ اور پر مغز مقالہ بھی پڑھا تھا۔کانفرنس میں شرکت کے سوال پر وہ بولے جانا ضروری تھا مگر ان دنوں جیب خالی تھی مگر پھر بھی پہنچے۔اس کی تائید میں سجاد ظہیر نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں لکھتے ہیں کہ ان دنوں فیض صاحب کے پاس کرائے کے پیسے تو تھے مگر بقیہ اخراجات کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

پھر فیض صاحب سے صوفی صاحب کے بارے میں پوچھا گیا کہ انہوں نے شرکت کی تھی تو وہ بولے ہماری تحریک تیزی سے ملک میں پھیلنے لگی چھ ماہ ہی گزرے ہی ہوں گے انگریز حکومت نے ہماری تحریک پر کمیونسٹ کا دھبہ لگا دیا اور پابندی لگا دی کہ سرکاری ملازمین اس میں حصہ نہیں لے سکتے۔صوفی تبسم سمیت ملازمت پیشہ ادیب، دانش ور، اور شعرا کرام نے نوکری کی قربانی دینے کی بجائے انجمن کو خیر باد کہہ دیا۔

فیض صاحب جب امرتسر میں تھے اور انجمن کا دفتر لاہور میں تھا تو فیض صاحب ہر اتوار کو لاہور آ جاتے تھے اور متفقہ طور پر میٹنگ کر لیتے تھے۔ انجمن کے اجلاس صوفی صاحب کے عدالت خان روڈ والے گھر پر ہوتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ صوفی صاحب کے جانے کے بعد فیض صاحب کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑا ہوگا تو فیض صاحب نے بتایا کہ لاہور میں ایک پنجاب لٹریری لیگ ہوا کرتی تھی۔ جس کے لیڈر ایک ہندو چودھری تھے اسی لیگ کے Active ممبر کشمیری پنڈت شنگلو جی تھے۔ ان کا دفتر شاہ دین بلڈنگ میں تھا۔ اب جلسے وہیں پر ہونے لگے آخر کار یہ لیگ بھی کچھ دنوں میں ختم ہو گئی۔ پھر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا آپ نے اپنا دفتر کرائے پر کیوں نہ لیا وہ کہنے لگے بھئی اس دور میں کرایہ ادا کرنے کو ہمارے پاس رقم نہ تھی۔ لاہور میں ایک بنگالی ہندو سینال نامی شخص کا ریگل سینما کے اوپر پینٹنگ کا اسٹوڈیو تھا۔ اس نے ہمیں اپنے پاس جگہ دی اور اجلاس بھی وہیں پر ہونے لگے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب سے سوال کیا ان دنوں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی بھی لاہور میں تھے انہوں نے جواب دیا یہ لوگ بعد میں آئے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں محمود الظفر، پنڈت جواہر لعل نہرو کے سیکریٹری ہو کر امرتسر سے چلے گئے اور ان کی جگہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایم۔اے۔او کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر امرتسر آ گئے۔ انجمن کا مرکز پہلے پنجاب میں تھا اب وہ تبدیل ہو کر امرتسر ہو گیا۔ یہاں پر انجمن کے روح رواں پروفیسر بی۔آر۔ کپور، منٹو اور خالصہ کالج کے پروفیسر ایڈوانی اور پروفیسر بھجوانی تھے۔ فیض صاحب نے مزید بتایا ہم نے اسی سال جلیانوالہ باغ میں ایک شاندار کانفرنس کی۔ جس سے تحریک کو بہت ترقی ہوئی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنسیں کہاں کہاں ہوئیں؟ کہنے لگے۔ میں تمام کانفرنسوں میں شریک نہیں ہو پاتا تھا۔ کیونکہ جنگ کا زمانہ تھا، البتہ الہ آباد اور دہلی والی کانفرنسوں میں شرکت کی تھی الہ آباد والی کانفرنس ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی یہ دوسری کانفرنس تھی۔ سر تیج بہادر سپرو نے اس کی صدارت کے فرائض

انجام دیئے۔اس کانفرنس میں اسرارالحق مجاز، جاں نثار اختر، کرشن چندر، معین احسن جذبی، مخدوم محی الدین، قاضی عبدالغفار، سبط حسن، جوش ملیح آبادی، منشی پریم چنداور مولوی عبدالحق بھی انجمن میں شامل ہو چکے تھے۔ پھر فیض صاحب نے ایوب مرزا کو بتایا ہم ۱۹۳۹ء میں لاہور ہیلی کالج میں پڑھانے لگے اور ادب لطیف کے مدیر بھی مقرر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں کانفرنس ہوئی۔ جس میں ہم نہ جا سکے اور کرشن چندر نے اس میں شرکت کی تھی امرتسر کے قیام کے دوران فیض صاحب نے لاہور سے نکلنے والے ادبی پرچے ادب لطیف کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیئے اور اسی طرح ادبی صحافت کے میدان میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی فیض صاحب کی موجودگی میں ادب لطیف جدید اور ترقی پسند ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور اس میں لکھنے والوں کو اپنی قابلیت دکھانے کا پورا موقع ہاتھ آ گیا۔ ادب لطیف کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ادب لطیف کی ادارت کی پیش کش ہوئی تو دو تین برس اس میں کام کیا۔ اس زمانے میں لکھنے والوں کے دو بڑے گروہ وادب برائے ادب کا اور دوسرا ترقی پسند ادب کا۔ کئی برس تک ان دونوں کے درمیان بحثیں چلتی رہیں جس کی وجہ سے کافی مصروفیت رہی جو بجائے خود ایک بہت ہی دل چسپ اور تسکین دہ تجربہ تھا''[۱۶]

اس زمانے میں لکھنے والے دو گروہ تھے ایک کی بنیاد ''ادب برائے ادب'' اور دوسرے کی ''ادب برائے زندگی'' کے حوالے سے تھی۔ دراصل ترقی پسند خیالات رکھنے والوں کو اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے کسی پلیٹ فارم کی ضرورت تھی۔ ادب لطیف نے ان کی اس ضرورت کو پورا کیا اور اس حوالے سے فیض کی نگرانی میں پنجاب میں اسے ترقی پسند ادب کا صحیح معنوں میں عکاس تصور کیا جاتا تھا۔

بقول فیض:

''یہ اصل مسئلہ تھا کہ اب جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ کہاں چھاپا جائے؟ ''ادب لطیف'' چوہدری نذیر احمد کی زیرنگرانی لاہور سے چھپ رہا تھا۔ ترقی پسند مصنفین وہاں چھپنے شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ یہ رسالہ ہماری تحریک کا آرگن بن گیا''۱۷

یوں فیض صاحب نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی کاوشوں کو ادبی حلقوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور کچھ ہدایات بھی دیں۔ فیض صاحب کے نزدیک ''ادب برائے ادب'' والے زیادہ تر ادبی دنیا میں لکھا کرتے تھے۔ ادب لطیف اور ادبی دنیا میں صلح ہوگئی۔ ادبی دنیا کے ایڈیٹر مولوی صلاح الدین تھے۔ فیض صاحب جنگ کے زمانے میں فوج میں شامل ہو گئے تھے میجر مجید ملک کے کہنے پر فیض صاحب نے ہیلی کالج کی نوکری چھوڑ کر فوج میں شمولیت اختیار کر لی ملازمت کی ابتدا میں دہلی کے قیام کے دوران وہ مجید ملک کے گھر ٹھہرے۔ پھر کیرول باغ میں مکان مل گیا۔ ڈاکٹر سلیم الزماں ان کے ہمسائے تھے یوں ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک کا دور خاصا پریشان کن تھا۔ جنگ کی ابتداء میں کافی لوگ انگریزوں کے خلاف ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں روس پر جرمن حملہ ہوا چونکہ دنیا کے ترقی پسند مصنفین روس کے اشتر کی نظریات سے خاصے متاثر تھے اب ان کی سوچ بھی تبدیل ہوگئی انہوں نے سوچ لیا اب حقیقت پسندانہ ادب لکھنا ہے وہ فاشزم کے خلاف جنگ میں کود گئے یہ پیپلز وار بن گئی اسی دوران میں ۱۹۴۰ء میں دانیا ل لطیفی نے بی بی سی لندن نے آفر بھیجی جسے فیض صاحب نے قبول نہیں کیا ور فوج میں چلے گئے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے عصمت چغتائی کے ''لحاف'' والے معاملے کا پوچھا تو بولے 'ادب لطیف'

میں عصمت چغتائی کی کہانی ''لحاف'' چھپی تو پورے ہندوستان میں جیسے ایٹم بم گرا ہو۔ ۱۹۴۰ء کی بات ہے ادب لطیف پر فحاشی کے نام پر مقدمہ چل پڑا۔ پھر فیض صاحب نے منٹو کے بارے میں بتایا کہ وہ ایم اے او کالج میں میرا شاگرد تھا۔

''مجھ سے عمر میں کوئی دو تین مہینے جونیئر ہوگا۔ تھا ذہین۔ مگر کسی کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھا بس میری عزت کرتا تھا اور مجھے استاد مانتا تھا'' ۱۸

اس نے بہت عمدہ افسانے لکھے۔ گورکی کے افسانوں کا میں نے ترجمہ کرنے کو کہا وہ کر دیتا تھا لیکن ۱۹۵۰ء میں وہ اپنی روش سے ہٹ گیا اور فلم والے اس سے جس قسم کی کہانی چاہتے تھے لکھوا لیتے تھے۔ اس پر جب بھی فحاشی کے سلسلے میں مقدمہ چلا ہم ہی اسے چھڑا لاتے تھے۔ اس طرح تین بار ہم اسے آزاد کرا لائے اور چوتھی بار سرکار نے پہلے ہمارا بندوبست کر لیا تھا اور منٹو کو قید ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ میں نے فیض صاحب سے پوچھا تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں ترقی پسند مصنفین نے عمدہ ادب لکھا اور کراچی کی کانفرنس میں مولوی عبدالحق اور مولانا عبدالمجید سالک نے اس ادبی تحریک کی contribution کے بارے میں تعریف اور اقرار سے بھرپور مقالے پڑھے اور یہ تحریک یہاں پر دم توڑ گئی۔ تو بولے تقسیم ہند کے بعد سجاد ظہیر اور مرزا اشفاق علی بیگ کلکتہ سے یہاں آئے۔ یہاں پر کمیونسٹ پارٹی بن گئی۔ سجاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو چھوڑ کر کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری بن گئے۔ یوں ۱۹۴۸ء میں ترقی پسند مصنفین پر پہلا حملہ ہوا سجاد ظہیر روپوش تھے۔ مزید فیض صاحب نے بتایا کہ لاہور کے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں یوم مئی کے سلسلے میں بڑا جلسہ ہوا ترقی پسند مصنفین کی انجمن آگے آگے تھی، ہال کے اندر اور باہر ہتھوڑے اور درانتی والے جھنڈے لگائے گئے سرخ جھنڈے لہرائے تو ایسا لگتا تھا کہ سرخ انقلاب آ گیا ہے جلسے کی صدارت ہم نے کی۔ اس وقت پاکستان میں آئی جی، ڈی آئی جی اور سی این سی سب انگریز تھے اس کی تائید میں ڈاکٹر ایوب مرزا ''فیض نامہ'' میں بھی لکھتے ہیں زیادہ تفصیل سے بات کی

ہے۔اردو اخبار ''احسان'' جو ترقی پسندوں کی مخالفت میں آگے تھا اس نے حملہ کر دیا اور لکھا:

۱: اسلام کی توہین ہوئی ہے

۲: لینن کو قائداعظم سے بڑا بنایا گیا ہے۔

۳: مرتدوں کا گروہ بن گیا ہے۔

چونکہ جلسے میں ادیبوں، دانش وروں کے علاوہ ٹریڈ یونین والے بھی تھے۔ یوں ترقی پسندوں میں تفریق ہوگئی فضل الٰہی قربان پارٹی سے باہر کر دیئے گئے اور انہوں نے مرزا ابراہیم سے الگ ہو کر کمیونسٹوں کے خلاف احسان اخبار میں لکھنا شروع کر دیا اس وقت فیض صاحب مرزا ابراہیم والی ٹریڈ یونین کے نائب صدر تھے جبکہ مرزا صاحب جیل میں تھے دراصل فیض صاحب ہی صدر تھے۔اسی سلسلے میں احمد سلیم اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''۴۹۔۱۹۴۸ء کے دوران فیض صاحب پاکستان ٹریڈ یونین کے نمائندے کے طور پر بین الاقوامی مزدور کانفرنسوں میں بھی شریک ہوئے۔کمیونسٹ پارٹی سے ان کا تعلق امرتسر کے قیام کے دنوں کا ہے۔مزدور سیاست سے ان کی وابستگی ان کو پارٹی کے قریب لے آئی''[۱۹]

فیض صاحب نے بتایا کہ ۱۹۴۸ء میں انگریز خود تو چلے گئے تھے مگر اپنے نمک خوار چھوڑ گئے تھے۔ان میں سے ایک خطیب مسجد وزیر خان نے ہمارے خلاف اور مولانا محمد علی جوہر کے خلاف خطبہ پڑھا تھا اور لوگوں کو ہمارے خلاف کر دیا تھا تو اس کے جواب میں ہم نے بیرون موچی دروازہ (لاہور) ریلوے یونین کا جلسہ کیا جس کی صدارت مرزا ابراہیم نے کی تھی۔ جلسہ میں پوسٹل یونین والے بھی شریک تھے۔ فیض صاحب اس یونین کے صدر رہ چکے تھے۔ اس کی تائید ڈاکٹر ایوب مرزا ''فیض نامہ'' میں بھی کر چکے ہیں۔ فیض صاحب جن دنوں یونین کے صدر تھے وہ یونین

کے کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔

اس سلسلے میں مرزا ظفر الحسن رقم طراز ہیں۔

''فیض صاحب پوسٹل یونین کے مسائل نہایت سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرتے تھے۔ نہ طول طویل بحث کرتے، نا ہی غصے میں آتے اور نا ہی کوئی ضمنی بات چھیڑ کر کسی نکتے کو الجھاتے۔ جہاں وہ یونین کے مفاد کے محافظ بن کر گفتگو کرتے وہیں محکمے کی جائز اور واضح مجبوریوں کو یک لخت نظر انداز بھی نہ کرتے جیسا کہ ایسی انجمنوں کے بیشتر لیڈروں کا عام رویہ ہوتا ہے''[۲۰]

ترقی پسندوں نے انجمن کی کانفرنس لاہور کے اوپن ائیر تھیٹر میں منعقد کی اور یہ کانفرنس بہت حد تک کامیاب رہی۔ اس کانفرنس میں فیض صاحب نے قوالی ''تماشہ ہم بھی دیکھیں گے'' پڑھی۔ ان دنوں انجمن کے سیکریٹری احمد ندیم قاسمی تھے۔ ۱۹۴۸ء میں تاثیر صاحب اور مولانا چراغ حسن حسرت ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے۔ تاثیر صاحب نے مخالف نظم لکھ کر 'احسان' اخبار میں چھپوادی اور مولانا چراغ حسن حسرت کہاں چوکتے۔ انہوں نے پھرتی سے کام لیتے ہوئے جواباً نظم لکھ کر 'نوائے وقت' میں چھپوادی پھر تاثیر صاحب، فیض صاحب کے ساتھ مل گئے۔ ۱۹۴۹ء شورش کاشمیری نے فیض صاحب اور تاثیر کے خلاف نظمیں لکھیں۔ حمید نظامی اس زمانے میں فیض صاحب کی حمایت کرتے تھے۔ ہم جو لیاقت علی خاں کے خلاف آزادی اور شہری آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہمارے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ یہ ساتھ جیل جانے تک قائم رہا۔

ترقی پسند مصنفین پر یہ الزام تھا کہ یہ انجمن دراصل کمیونسٹ پارٹی کی پیداوار ہے۔؟ فیض صاحب بولے بھئی ایسا نہیں ہے منشی پریم چند کا کمیونسٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مولانا سالک، مولانا چراغ حسن حسرت اور مولانا حسرت

موہانی کہاں کے کمیونسٹ تھے اور ہم خود کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے۔ مزید فیض صاحب بتاتے ہیں کہ اس پروپیگنڈے کی دو وجہ تھیں تقسیم ہند سے پہلے انگریز حکومت نے اس انجمن کے بارے میں یہ اعتراض کیا تھا۔ پھر تقسیم ہند کے نو آبادیاتی نظام نے نیا روپ دھار لیا۔ اب ورلڈ بنک اور انٹرنیشنل فنانس کیپٹل اور بعد میں کنسورشیم نے جگہ لے لی۔ امریکہ کا مارشل پلان تو یاد ہوگا۔ اس زمانے میں نئے liances کا اجراء ہوا پھر فیض صاحب عالمی امن کمیٹی کے بارے میں بتاتے ہیں۔

''امریکہ کے ایٹم بم کے خلاف عالمی امن کمیٹی نے ایک سٹاک ہوم امن اپیل جاری کی۔ یہ اپیل روسی قیادت کے زیر اثر تھی۔ تمام دنیا کے عوام نے جو عالمگیر جنگ سے تباہ ہو چکے تھے اس پر لبیک کہا۔ ہمارے ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے بھی اس امن اپیل پر دستخط کرنے کی ہدایات جاری کی۔ کیونکہ یہ جنگ اب خونخوار فاشزم کی شکست کے بعد انسان دشمن سامراج کے نئے ہتھکنڈوں کے خلاف تھی''[۲۱]

پھر انجمن میں کمیونسٹ پارٹی، کسان کمیٹی اور ٹریڈ یونین کے لوگ بھی شامل تھے مزید بتاتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کی ابتداء ایک نئے موضوع سے شروع ہوئی پھر اسے انتہا پسندی کی بیماری لگ گئی۔ پھر کچھ انتہا پسند لوگوں نے ادب کے دھارے کو حقیقت پسندی سے کومیٹڈ سوشلسٹ حقیقت پسندی کی طرف تبدیل کرنے کی کوشش کی آخر میں ایوب مرزا نے فیض صاحب سے سوال کیا کہ آپ کے خیال میں یہ تحریک کامیاب رہی یا ناکام ہوئی تو وہ بولے:

''بھئی ایک طرف سے تو یہ کامیاب رہی کیونکہ گلشن ادب میں اس تحریک نے ایک نئی طرز فغان دی اور اب وطن میں بیان کی یہی طرز ٹھہری ہے۔ دوسرے لحاظ سے اس تحریک کو دھکا لگا وہ ہمارے چند انتہا پسند دوستوں کی وجہ سے''[۲۲]

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھ لیا کہ ۱۹۴۹ء میں آپ ترقی پسند تحریک سے کیوں الگ ہو گئے تھے اس کے جواب میں بولے ۱۹۴۹ء میں احمد ندیم قاسمی جنہوں نے حقیقت پسندانہ ادب تحریر کرنے میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی وہ اس انجمن کے سیکریٹری تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ علامہ اقبال کو مسمار کر دیں اور عصمت چغتائی اور منٹو، ن۔م راشد کو علیحدہ کر دیں یہ ترقی پسندی کے معیار پر پورا نہیں اترتے۔ ہمیں یہ فضول باتیں لگیں اور پھر ہماری ان سے جنگ ہو گئی۔ اس کی تائید ڈاکٹر ایوب مرزا ''فیض نامہ'' میں بھی کرتے ہیں اس کی تائید میں مظفر اقبال بھی یہی لکھتے ہیں جنہوں نے فیض صاحب سے مکالمہ کیا پوچھا کہ آپ ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند تحریک سے الگ ہو گئے تھے انہوں نے جواب دیا نہیں ہم اس طریقے سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ جن چیزوں سے ہمیں اتفاق نہیں تھا ان کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس زمانے میں علامہ اقبال کے متعلق غلط باتیں کی گئیں اور منٹو، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی اور ن۔م راشد کے بارے میں ہماری رائے میں غلط رویہ اپنایا گیا۔ اس وجہ سے ہم نے علیحدگی اختیار نہیں کی تھی، بنیادی طور پر یہ تحریک صحیح ہے۔ بقول مظفر اقبال:

> ''یہ فروعات ہیں جس حد تک اختلاف تھا اس حد تک ہم نے اس میں شریک ہونے سے انکار کیا۔ لیکن تحریک سے تو ہم نے علیحدگی اختیار نہیں کی تھی۔''[۲۳]

دراصل فیض صاحب کے نزدیک تحریک اور تنظیم کا ہمیشہ سے فرق رہا ہے۔ ان کے نظریات سے اختلاف رکھنے والے لوگوں نے بہت بار اس طرح کی گفتگو کی ہے۔ جیسے وہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو خیر باد کہہ چکے ہوں۔ فیض صاحب خود بھی صحافت کی دنیا سے وابستہ رہ چکے تھے بلکہ کئی بار انہوں نے اس کی تردید کی ہے۔ اگر انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا نہیں کیا تو اس کی وجہ ترقی پسندی کی نشستوں میں انتہا پسندی کی شمولیت تھی۔ علامہ اقبال پر کی گئی تنقید کا انہوں نے نوٹس لیا تھا۔ ایک دن مظہر علی خاں کے گیراج میں انجمن کی میٹنگ ہوئی اس کے صدر صفدر میر تھے قاسمی

صاحب نے علامہ اقبال کے خلاف ایک مقالہ پڑھا جس سے ہمیں بہت تکلیف اور رنج ہوا۔ ہم نے اعتراض کیا یہ کیا تماشہ ہے۔ یہ تو انتہا درجے کی انتہا پسندی ہے۔ پھر ہماری نہ مانی گئی اور اس بات سے ہمیں صدمہ پہنچا اور اس کے بعد انجمن کی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے۔ پاکستان ٹائمز چلاتے رہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے سلیمہ سے پوچھا آپ ابو کو کب سے جانتی ہیں تو بولی جب ابو پنڈی میں فوجی ملازمت کرتے تھے۔ میں اس وقت دو سوا دو سال کی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی سلیمہ نے ایک واقعہ سنایا کہ ہمارے بنگلے کے باہر ایک بڑھیا بھکارن بیٹھا کرتی تھی اس کا ایک لڑکا تھا۔ شکل اصورت تو اس کی اب یاد نہیں۔ لڑکا بڑی مہارت کے ساتھ لکڑی کی بیساکھی کی مدد سے ہر آنے جانے والے کے پیچھے بھاگتا رہتا تھا اور میں اس کو غور سے دیکھا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے اس لڑکے کی نقل اتارتے ہوئے اسی طرح چلنے لگی۔ ابو نے دیکھ لیا پوچھا کیا ہوا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ کچھ نہیں تو بولے پھر لنگڑا کر کیوں چل رہی ہو۔ میں ان کو پوری کہانی سنا دی۔ تو وہ ناراض ہونے لگے۔ غریبوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے بلکہ ان کی مدد کرنی چاہیے۔ مزید سلیمہ بتاتی ہیں کہ تب میں نے جانا محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ اسوقت مجھے ان تمام باتوں کا علم نہیں تھا اور پھر اس واقعہ کے بعد سلیمہ کے دل میں لوگوں کے دل میں محبت بڑھ گئی۔ کہنے لگی میں نے کبھی ابو کے منہ سے سخت الفاظ نہیں سنے تھے۔ وہ ملازموں سے لے کر ہم سب کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ سلیمہ نے اپنے انٹرویو کے دوران بتایا کہ ایک دن ممی ہسپتال چلی گئیں اور مجھے ابو کے پاس چھوڑ گئیں جبکہ میں ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ میں نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ ابو نے پوچھا کیوں رو رہی ہو؟ اور میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور روتی رہی میرا خیال تھا وہ سمجھ جائیں گے کہ اس کی ماں ہسپتال گئی ہے۔ پھر پوچھا بھوک لگی ہے میں ابھی بازار سے تمہارے لیے بسکٹ لاتا ہوں۔ اب جو بسکٹ کھایا تو اس قدر بدمزہ اور گلے میں پھنسنے والا تھا، میں نے اس پر بھی زاروقطار رونا شروع کر دیا پھر بولے میں تمہارے لیے دودھ لاتا ہوں دودھ کے ساتھ یہ زیادہ

مزے دار ہو جائیں گے حالانکہ مجھے دودھ سے چڑ تھی اور ابو دودھ پلانے کے شوقین تھے پھر دوسرے دن ممی واپس آ گئیں۔ بقول سلیمہ:

''وہ ہمارے لیے پیار، محبت اور سکون کی ایک بہت بڑی اور گہری کمیں گاہ تھے۔ یہ استقامت کا، صبر کا اور غم خواری اور ہمدردی کا بحرالکاہل ہیں۔ میں نے انہیں کبھی کسی پر چیں بہ جبیں ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔''[۲۴]

بلکہ ان کی ذات سے تو ہر کسی کو سکون ملتا تھا، وہ کسی پر غصہ نہیں کرتے تھے۔ سلیمہ کہتی ہے کہ مجھے ہر روز سکول جانا پسند نہیں تھا اور ممی کو میری یہ عادت پسند نہیں تھی جبکہ ابو اس معاملے میں میرے بڑے ہمدرد تھے، ایک دن کہا ابو سر میں درد ہے آج اسکول نہیں جاؤں تو کہنے لگے نہ جاؤ، وہاں کیا رکھا ہے۔؟ میں حساب میں خاصی نالائق تھی، حساب مجھے بالکل نہیں آتا تھا اور ایک دن ابو نے مجھ سے پوچھ لیا، پڑھائی کیسی چل رہی ہے تو میں نے صاف بتا دیا کہ مجھے حساب بالکل نہیں آتا تو کہنے لگے مجھے بھی نہیں آتا تھا۔ میں نے بعد میں سیکھ لیا تھا۔ سلیمہ نے انہیں مزید بتایا جب میں آٹھ برس کی ہوگئی اور ابو فوج سے ''پاکستان ٹائمز'' میں آ گئے اس دوران ان سے بہت کم ملاقات کا موقع ملتا تھا۔ وہ اخبار چلانے میں مصروف تھے اور ممی گھر چلانے میں مصروف رہتی تھیں۔ ہم لوگ اس وقت میٹرو ہوٹل (لاہور) کے اوپر والے فلیٹ میں شفٹ ہو گئے تھے۔ سلیمہ نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو بتایا پھر ایک شب پولیس والے آئے۔ ابو کو گرفتار کر کے لے گئے۔ بقول سلیمہ:

''مجھے پیار کیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ میرے گالوں کو تھپکتے ہوئے ابو نے کہا خدا حافظ۔ میں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور پھر سو گئی۔''[۲۵]

اس کی تائید ڈاکٹر ایوب مرزا ''فیض نامہ'' میں بھی کر چکے ہیں۔

حالانکہ اس وقت میزو بہت چھوٹی تھی۔ سلیمہ کو بھی سیاسی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ وہ بھی حیران تھی کہ یہ کیا ہو گیا

ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ لیاقت علی خاں کے دور حکومت میں فیض صاحب اور دیگر فوجی اور غیر فوجی حضرات کو ایک سازش کے تحت گرفتار کیا گیا تھا یہ لوگ اپنے ملک کے خلاف سازش کرتے ہوئے پکڑے گئے اور ملک کو بچالیا گیا ہے۔ جسے بعد میں ''راولپنڈی سازش'' کا نام دیا گیا۔سلیمہ نے انہیں بتایا کہ جب ابو پاکستان ٹائمز کو چلا رہے تھے۔تب ہمارے حالات کافی اچھے تھے میں اور میزو کوئن میری میں پڑھتی تھیں۔ابو کے جیل جانے کے بعد ہم دونوں کنئیر ڈ ہائی سکول میں آ گئیں۔

پھر ڈاکٹر ایوب مرزا نے سلیمہ سے سوال کیا کہ ابو تو جیل چلے گئے تھے آپ لوگوں کی گزر بسر کیسے ہوئی تھی۔؟اس نے کہا ممی نے نوکری کر لی تھی۔ممی نے گھر کا نظام سنبھال لیا تھا۔ابو نے کبھی کوئی رقم بچا کر نہیں رکھی تھی مگر ہمیں جس بات کا دکھ ہے، ہمارے گھر میں کوئی ملنے نہیں آتا تھا۔ جہاں لوگوں کا ہجوم لگا رہتا تھا اب وہاں خاموشی تھی اور مجھے اس خاموشی سے ڈر لگتا تھا۔پھوپھی بالی ہمیں ملنے آتی تھی۔فیض صاحب کے جیل جانے کے بعد سلیمہ کی پڑھائی میں کافی خلل پڑ چکا تھا۔سلیمہ حساب اور اردو میں کافی کمزور تھی۔پھر ایلس اپنے دفتر سے ایک صاحب نظام صاحب تھے انہیں لے آئیں انہوں نے سلیمہ کو حساب اور اردو میں تیز کیا۔

سلیمہ نے ایوب مرزا کو بتایا کہ نظام صاحب درویش آدمی تھے میں نے انہیں پہلے ابو کے دوستوں میں نہیں دیکھا تھا۔وہ ہمارے لیے فرشتہء رحمت بن کر آئے تھے جب تمام لوگوں نے ہم سے منہ پھیر لیا تھا اور بخاری صاحب بھی ایک مرتبہ ہمارے گھر تشریف لائے اور ہمیں ۵۰۰ روپے دیئے کاش وہ ۵۰۰ روپے کی جگہ ۵۰۰ مرتبہ ہمارے گھر آتے۔کیونکہ ہم لوگ ان سے بہت محبت کرتے تھے اس وقت سب لوگوں کو پتہ تھا کہ ابو پر سازش کیس چل رہا ہے، اس کے باوجود ان کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ہم سے بہت محبت سے پیش آتے تھے دعائیں دیتے تھے کہ اللہ جلد ہمیں ابو سے ملا دے گا۔سلیمہ نے بتایا کہ ایک دن میں سکول سے گھر واپس آ رہی تھی بس میں تھی نہ جانے کیوں اس دن ابو بہت زیادہ یاد آ رہے تھے اور جب گھر کے

قریب پہنچی تو دیکھا عبداللہ ملک، حمید ملک والا قافلہ جا رہا تھا تو میں سمجھ گئی کہ ابو واپس آ گئے ہیں اور گھر میں داخل ہوئی تو ابو واپس آ گئے تھے۔ میں خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی ابو کو گلے ملی۔ ابو نے کہا اب ہم لوٹ آئے ہیں واپس نہیں جائیں گے۔ پھر وہ پاکستان ٹائمز میں کام کرنے لگ گئے۔

ممی کو شکایت رہتی تھی میں پڑھائی دل لگا کر نہیں کرتی تھی اور ابو کچھ نہیں کہتے تھے ایک دن ابو کہنے لگے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لاؤ تو تمہیں سونے کی انعام دوں گا۔ اب دو باتیں تھیں ایک سونے کی گھڑی اور ابو کی خواہش کا بھی تو پاس رکھنا تھا اور میں خوب محنت کی اور اپنے سکول میں فرسٹ آ گئی اور شام کو ابو گھر آئے تو انہیں بتایا کہنے لگے میں اخبار چلاتا ہوں، مجھے معلوم ہے یہ لو سونے کی گھڑی پھر ابو جیل چلے گئے۔ ابو کا جیل جانا ہمارے لیے معمول بن گیا تھا اور ہم ایسی زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔

پھر جب ایوب کے دور حکومت میں ابو گرفتار ہوئے تھے ماسکو سے واپس آئے تھے کہ ایک روز پہلے میری سالگرہ بڑے اچھے طریقے سے منائی اور دوسری صبح پولیس والے آ گئے اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ سلیمہ نے ایوب مرزا کو بتایا کہ ایک دن ابو اور ممی آپس میں گپ شپ کر رہے تھے تھوڑی دیر بعد ابو میرے پاس آئے اور کہنے لگے ہم نے تمہارے لیے تھوڑی سی رقم بچا کر رکھی ہے یہ لے لو۔ اس رقم سے یا تو شادی کر لو یا مزید تعلیم حاصل کر لو۔ تو میں نے کہا میں آگے پڑھوں گی اور پڑھنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب ماسکو سے لندن، لندن سے کراچی اور کراچی سے جیل جا پہنچے۔ چونکہ کہ ملک میں ایوب خان کا مارشل لاء لگ چکا تھا۔ فیض صاحب کے اکثر خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ ایسے حالات میں اپنے ملک واپس نہ جائیں۔ مگر فیض صاحب بضد تھے کہ اپنے وطن واپس جانا ہے۔ پھر روس میں کسی نے مشورہ دیا کہ واپس جاتے ہی جیل منتقل ہو جائیں گے۔ جیل جانا کوئی اچھا فعل ہے نہ سیاسی اور سماجی لحاظ سے مگر فیض صاحب نے کسی کی نہ مانی۔

بقول فیض:

''بھئی اگر دنیا میں جیل سے بھی کوئی بدتر چیز ہے تو پھر ملک کی خاطر، اپنے وطن کی ان جیالوں کے لیے جن کی پگ دھجیاں ہو جاتی ہے۔ بہر حال وہ بھی قبول ہے اور اگر اس سے بڑھ کر کوئی اور دکھ، درد، اذیت اور جبر میرے دشمنوں، میرے وطن کے دشمنوں اور میرے پیارے تانگے والوں کے دشمنوں کے قبضے میں ہمارے لیے ہوں تو پھر بھی ہم لوگ اپنے ملک میں سر اٹھا کے چلیں گے'' ۲۶

فیض صاحب کو اپنے مزدوروں، کسانوں اور غریب لوگوں کا احساس تھا۔ جن کا بار بار استحصال کیا جا رہا تھا۔ وہ میرے ملک میں عوام دشمن نہ آج کامیاب ہوئے ہیں اور نہ کل ہوں گے۔ میرے ملک کے عوام سادہ ہی ہیں مگر ان کی اجتماعی عقل افلاطون اور ارسطو سے کئی گنا زیادہ ہے۔ آخر کار فیض صاحب واپس آ گئے اور وہی ہوا جس کا خوف تھا۔ وہ جیل بھیج دیئے گئے۔ ملک میں مارشل لاء لگ چکا تھا۔ ایوب خاں کو ملک کے ٹھیکیداروں اور سوداگروں نے نجات دہندہ کا رتبہ دے دیا تھا اور فیض صاحب جیل میں اپنے نغمے کی بازگشت سن رہے تھے:

''ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے''

اور

''یہ وہ سحر تو نہیں ہے جس کی آرزو لے کر''

ہمیں ان واقعات کا بہت دکھ ہوا۔ ہمیں یقین تھا کہ آخر یہ ظلم ایک دن ختم ہو جائے گا اور ہم فیض صاحب کے صبر و تحمل کے قائل ہو گئے کہ وہ اپنے ملک کے عوام کے لیے جیل کے مظالم کو خوشی خوشی برداشت کر لیتے۔ پھر ایک دن لاہور

جیل سے فیض صاحب کی آواز بلند ہوئی۔

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگذر میں گزراں

نہ ہوا کہ مرمٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

لو سنی گئی ہماری، ہوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے

وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصل گل کا ماتم

اور یوں فیض صاحب جیل میں تنہا اپنے وطن کی یاد میں گیت گاتے رہے اور جیل کے باہر ناسمجھ لوگ جن کو پتہ نہیں تھا کہ انکے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ ایوب خاں کو دیکھ کر خوش ہو گئے آخر کار نجات دہندہ آ گیا ہے اور فیض صاحب جیل میں تنہائی کا شکار تھے۔ چونکہ فیض صاحب ۱۹۵۸ء کی تاشقند کی ایفرو ایشائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر انہیں ۱۹۵۸ء میں گرفتار کیا اور ۱۹۵۹ء میں رہا ہوئے۔ اس دوران انہیں تفتیش کے لیے شاہی قلعہ لاہور لے جایا گیا اس موقع پر سبط حسن لکھتے ہیں جن دنوں فیض صاحب شاہی قلعہ میں نظر بند تھے اس دوران ایوب خاں کا حکم جاری ہوا کہ سب وزراء اور سرکاری افسر اور اہل دولت اپنے اپنے اثاثوں کا گوشوارہ داخل کروائیں۔ بقول سبط حسن:

''اہل ثروت و اقتدار نے اس اعلان پر جس دیانت داری سے عمل کیا اس کا تذکرہ فضول ہے کیونکہ فوج نے ملکی حالات کی اصلاح کے لیے حکومت پر قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ دولت کی لوٹ کھسوٹ میں شریک ہونا مقصود تھا لہذا اثاثوں کی تفصیلات کون پیش کرتا اور کون ان کی چھان بین کرتا'' ۲۷

اس موقع پر فیض صاحب نے ایک قطعہ قلعے میں لکھا۔

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو

جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں

دامن میں ہے مشت خاک جگر، ساغر میں ہے خون حسرت مے

لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام الٹائے دیتے ہیں

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کے کوئی جمع پونجی نہیں تھی ۔ جس سے ایلس اپنا گھر اور بچیوں کی ضروریات کو پورا کر سکتی۔ فیض صاحب کافی پریشان رہتے تھے کہ ان کی بچیاں کیا سوچتی ہوں گی ان کو کیسا باپ ملا ہے جو آئے دن جیل چلا جاتا ہے۔ فیض صاحب جیل سے اپنی نظمیں اور غزلیں لکھ کر ایلس کو بھیجا کرتے تھے اور پھر انور (ننھا) جیسے لوگ یہ نظمیں لے کر ناشروں کو تلاش کرتے تھے۔ بھئی یہ خرید لو۔ بڑے کام کی چیز ہے اب کسی ناشر کو ہمت نہیں ہوتی تھی وہ فیض کا کلام خرید لے۔ اس کا کام تو کاروبار چلانا ہے اسے کیا کہ فیض صاحب کے گھر کا کچن نہیں چلتا۔ آخر کار اسے گلی سے کوئی خریدار نہ ملتا تو وہ دوسرے کوچے میں پہنچ جاتا۔ اس کباڑ خانے میں پھر بھی کوئی ناشر ہمت کر کے آگے بڑھتا دس روپے یا بیس روپے میں فیض کی غزل لے اڑتا تھا اور جب فیض صاحب کو یہ اطلاع ملتی تھی کہ آج ان کی نظم دس روپے میں آپ کے لاہور شہر کے ناشروں نے خرید لی ہے اور یہ روپے ایلس تک بحفاظت پہنچ گئے ہیں تو انہیں اطمینان ملتا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب آخر کار رہا ہو گئے۔ رہائی کے بعد فیض صاحب کو حکومت کی طرف سے ''پاکستان ٹائمز'' کی 'چیف ایڈیٹری' پیش کی گئی۔ انہیں خریدنے کی کوشش کی گئی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

اس سلسلے میں سبط حسن لکھتے ہیں۔

''۱۹۵۹ء میں فیض صاحب نے 'الحمراء' کا انتظام سنبھالا۔اس ادارے کو صوبائی حکومت کی طرف سے کچھ امداد بھی ملتی تھی۔مگر شہر میں اس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔سال میں کبھی کسی فنکار نے اپنی تصویروں کی نمائش کر دی یا پھر کوئی ڈرامہ ہو گیا۔''۲۸

لیکن فیض صاحب نے اپنی محنت اور نوجوانوں کی مدد سے الحمراء کی حالت بدل کر رکھ دی۔ابتداء میں تو سرکاری حلقوں نے الحمراء کی سرگرمیوں میں دلچسپی نہیں لی بلکہ فیض صاحب کے کام پر نکتہ چینی کرتے رہے۔جب الحمراء کا چرچا ہوا تو اس دوران سرکاری افسروں نے ایوب خاں کو مشورہ دیا کہ ثقافت کی سرگرمیوں حکومت کو مداخلت کرنی چاہیئے۔سبط حسن لکھتے ہیں۔

''حکومت کی طرف سے پشاور، راولپنڈی، کراچی اور لاہور کی آرٹس کونسل کے سربراہوں کا ایک اجلاس ڈھاکے میں طلب کیا گیا۔فیض صاحب اس اجلاس کے مقصد سے بخوبی واقف تھے۔پھر بھی وہ اجلاس میں شریک ہوئے لیکن واپس آتے ہی ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ تین ماہ تک بستر پر پڑے رہے۔''۲۹

سبط حسن لکھتے ہیں کہ انہوں نے آرٹس کونسل سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔دو سال انہوں نے محنت کر کے اس کونسل کو کسی مقام پر لا کھڑا کر دیا۔اس سے جدا ہونے پر ان پر کیا گزری ہو گی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ملک میں مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا اور فیض

صاحب لندن میں تھے۔لندن میں انہیں رہنا کبھی پسند نہیں تھا۔لندن کے pubs،تھیٹر، بیلے،اوپیرا کے بارے میں کہتے تھے۔بس ٹھیک ہیں انہیں پسند نہیں آتے تھے۔اس دوران ان کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ واپس نہ جائیں اگر وہ چلے گئے تو ان کے ساتھ برا سلوک ہوگا اور وہی ہوا۔وطن واپس آتے ہی انہیں جیل میں بھیج دیا گیا انہی دنوں جیل میں ان کے ساتھ ایک انوکھا تجربہ ہوا۔جیل میں فیض صاحب کے دانتوں کی تکلیف بڑھ گئی انہوں نے اس موقع پر ایک نظم آج بازار میں پابجولاں چلو۔اس واقعے کے متعلق ایوب مرزا نے فیض صاحب سے تفصیل جاننی چاہی تو وہ ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے بولے:

''آج بازار میں پابجولاں چلو۔کا واقعہ یوں ہے کہ ہم منٹگمری (ساہیوال) جیل سے دانتوں کے علاج کے لیے کچھ دن کے لیے لاہور جیل لائے گئے۔یہاں سے ہر صبح دانتوں کے ہسپتال جو شہر کے دوسرے کنارے پر ہے۔پولیس کی گاڑی میں جانا ہوتا تھا۔ایک دن موٹر نہ مل سکی۔تو ہمیں تانگے میں مسلح گارڈ کے ساتھ ہسپتال جانا پڑا۔لارنس روڈ، مال روڈ، کچہری روڈ، بیرون بھاٹی دروازہ اور راوی روڈ سے گزرے تو بہت سے لوگوں نے پہچان لیا۔کئی جگہ مجمع ہو گیا اور نعرے وغیرہ بھی لگے۔یہ نظم اسی واقعہ سے متعلق ہے''[۳۰]

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ میں نے فیض صاحب سے کہا کہ لاہور قلعہ ہماری تاریخ کا ایک اہم مقام ہے۔پی این سی اے کو چاہیے کہ پنجاب آرٹ کونسل کے ساتھ لڑائی کر کے قلعے کے اوپر اپنا قبضہ حاصل کر لے۔قلعہ لاہور میں ہے اس وجہ سے پنجاب آرٹ کونسل اس پر اپنا حق جتا سکتی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ قلعہ نیشنل ہے اس میں مجوس کیے گئے لوگ ملک کے ہر کونے سے لائے گئے تھے۔کیونکہ اس حوالے سے اشفاق حسین لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۹ء میں فیض صاحب شاہی قلعے میں قید کیے گئے تھے۔کسی زمانے میں ان کے والد بھی اسی قلعے میں قید رہے تھے۔

شاہی قلعے کو قومی ورثہ قرار دیئے جانے کے سوال پر فیض صاحب نے جواب دیا:

''بھئی یہ ہمارا تاریخی اثاثہ ہے۔اسے جیل خانہ واقعی نہیں بنانا چاہیئے۔جیلوں کی ملک میں کیا کمی ہے۔قلعہ تو ہمارا ورثہ ہے۔''[۳۱]

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب ۱۹۶۲ء میں لینن امن انعام حاصل کرنے کر بعد لندن میں کچھ عرصہ قیام پذیر رہے۔اسی دوران میری ملاقات ان سے ہوئی۔انہوں نے فیض صاحب سے اپنے انٹرویو کے دوران سوال کیا کہ آپ ماسکو میں ہی ڈیرے لگا لیتے اور وہیں خوش بھی رہتے۔تو فیض صاحب نے جواب دیا کہ رہنے کے لیے کہیں بھی رہ سکتے تھے۔جب ہمیں انعام ملا ہمیں کیوبا سے آفر آئی،الجزائر سے آئی،مصر اور عراق والوں نے بھی آنے کی پیشکش کی۔ہم ان سب ملکوں میں گھومے پھرے،ہمیں اچھے طریقے سے خوش آمدید کیا گیا۔اپنا ملک تو اپنا ہوتا ہے پھر فیض صاحب نے ناظم حکمت کی مثال دی۔بقول فیض:

''ناظم حکمت کو ترکی کا علامہ اقبال سمجھ لو۔علامہ مرحوم نے مزدوروں کے گیت لکھے مگر مزدوروں کی عملی سیاست میں نہیں الجھے اور سیدھے معرفت کی طرف نکل گئے۔ناظم حکمت الجھ گئے اور رفتہ رفتہ کمیونسٹ ہو گئے''[۳۲]

پھر انہیں جیل ہو گئی۔دس بارہ برس جیل میں گزارے ایک دن وہ غائب ہو گیا اور ماسکو جا پہنچا۔ترکی کی حکومت نے اس کی غیر موجودگی میں اسے پھانسی کی سزا سنا دی جبکہ ماسکو میں اس کی بڑی عزت افزائی ہوئی۔سوچی میں ایک مکان دیا،ماسکو میں گھر دیا اور پھر منسٹر سے آگے کا درجہ دیا لیکن وہ یہاں خوش نہیں تھا۔اس کا دل ترکی میں تھا اور اس کی کافی شاعری بھی اسی موضوع پر ہے۔اس کی خواہش تھی جب میں مروں تو ترکی میں دفن ہوں لیکن ترکی کی حکومت نے اسے ترکی میں

دفن نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ ناظم حکمت کے علاوہ کوئی اور انقلابی آپ کو ملا۔ جو ملک بدری کی سزا کاٹ رہا ہو تو فیض صاحب بولے جووتو اسکارنو کے خلاف COUP DETATE کے وقت وزیر تھا۔ وہ بھی جرنلسٹ کے ساتھ ہی کمیونسٹ تھا۔ وہ چین چلا گیا تھا اور ابھی تک وہیں ہے۔ جبکہ انڈونیشیا میں پھانسی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ حالانکہ جووتو کو چینیوں نے عزت و احترام کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ مگر اس کا دل، اس کا دماغ، اس کی نظریں انڈونیشیا پر گڑھی ہوئی ہیں کیونکہ اس کو کہیں سکون نہیں ملتا تھا۔ بقول فیض:

''بھئی یہ ناممکن ہے کہ آپ اپنے عوام سے ناطہ توڑ کر چین کی بانسری بجا سکیں''[۳۳]

فیض صاحب کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی مجبوری نہیں تھی اس لیے واپس آ گئے۔ ہمارا دل صرف اپنے وطن میں لگتا تھا اور اپنے وطن کے لوگوں کے لیے دھڑکتا تھا۔ اس لیے ہم کسی دوسرے ملک میں زیادہ عرصہ قیام پذیر نہ ہو سکے۔

فیض صاحب کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ کہیں بھی جاتے ان کے مداح خوشی خوشی ان کا استقبال کرتے تھے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں ان کا جشن بھی منایا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۲۵

۲۔ ایضاً، ص ۴۴

۳۔ ایضاً، ص ۴۶

۴۔ ایضاً، ص ۴۹

۵۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۵۰

۶۔ ایضاً، ص ۶۲

۷۔ ایضاً، ص ۷۳

۸۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۹۵

۹۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۸۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۱۳۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۱۰۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۶۔۹۷

۱۵۔ ایضاً،ص۱۲۰

۱۶۔ اظفرالحسن، مرزا،''عہد طفلی سے عنفوان شباب تک''،مشمولہ مقالمات فیض،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱، لاہور ،مرتبہ:خلیل احمد، ص۹۱۔۹۲

۱۷۔ ایوب مرزا،ڈاکٹر،''ہم کہ ٹھہرے اجنبی ''،دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء،اسلام آباد،ص ۱۲۷

۱۸ ۔ ایضاً،ص۱۳۰

۱۹ ۔ احمد سلیم،"فیض:یادیں،باتیں"،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء،لاہور،ص۹۶

۲۰۔ ظفرالحسن، مرزا، ''عمر گزشتہ کی کتاب''،حسامی بکڈپو،۱۹۷۸ء،حیدرآباد انڈیا،مشمولہ اشفاق حسین،''فیض احمد فیض شخصیت اور فن''،اکادمی ادبیات،۲۰۰۶ء،اسلام آباد،ص۶۹

۲۱۔ ایوب مرزا،ڈاکٹر،''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''،دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء،اسلام آباد،ص۱۳۶

۲۲۔ ایضاً،ص۱۳۷

۲۳۔ مظفر اقبال،''فیض سے مکالمہ''،مشمولہ فیض کے مغربی حوالے،جنگ پبلشرز،۱۹۹۲ء،لاہور،ص۲۰۵ ،مرتبہ:اشفاق حسین

۲۴۔ ایوب مرزا،ڈاکٹر،''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''،دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء،اسلام آباد،ص۱۵۵

۲۵ ۔ ایضاً،ص۱۵۷

۲۶ ۔ ایضاً،ص۱۷۹

۲۷۔ سبط حسن،''سخن در سخن''،مکتبہ دانیال،۲۰۰۹ء،کراچی،ص۵۴

۲۸۔ ایضاً،ص۵۸

۲۹۔ ایضاً،ص۶۰

۳۰۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۱۹۷

۳۱ ۔ ایضاً،ص۱۹۸

۳۲ ۔ ایضاً،ص۲۱۳

۳۳۔ ایضاً ص۲۱۵

باب سوم:

فیض نامہ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

فیض نامہ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

ڈاکٹر ایوب مرزا فیض شناسی میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کی کتاب ''فیض نامہ'' فیضیات یعنی فیض سٹڈیز میں بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ''فیض نامہ'' کوئی ٹھوس اور روایتی طرز کی سوانح عمری نہیں بلکہ بکھرے خیالات ہیں جنہیں میں نے محنت سے یادوں کی ایک خوبصورت لڑی میں پرونے کی کامیاب سعی کی ہے۔یہ بہت بڑی ہمت اور دلیری کی بات ہے کہ ''فیض نامہ'' جیسی ضخیم اور طویل کتاب تحریر کرنا۔ذیل میں فیض صاحب کے سوانحی پہلوؤں پر بالترتیب تبصرہ کروں گی۔

فیض احمد فیض کے سوانحی پہلو ایک نظر میں:

فیض صاحب کے والد سلطان محمد خاں سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کے ایک پسماندہ گاؤں کالا قادر میں ایک غریب کسان صاحبزادہ خاں کے گھر پیدا ہوئے۔بقول فیض:

> ''بھئی سیالکوٹ کی تحصیل نارووال میں دو بھائی کالا اور قادر آ کر بسے۔وہ کون تھے؟ کیا کرتے تھے کوئی نہیں جانتا۔اسی بستی کا نام انہیں کے نام سے منسوب ہے۔''[1]

فیض صاحب کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایک راجہ ہوا کرتا تھا۔جس کا نام سین پال تھا اور اس کا تعلق سہارنپور سے تھا۔اس کی اولاد میں سے ایک نے اسلام قبول کر لیا تھا۔فیض کے والد سلطان محمد خاں کا تعلق بھی اسی شاخ سے تھا۔فیض

کے پردادا سر بلند خاں اور دادا صاحب زادہ خاں کالا قادر کے باسی تھے۔ یہ لوگ نادار، مفلس اور معمولی کاشت کار تھے اور غربت کا یہ عالم تھا کہ مٹی کا چراغ سر شام گل کر دیا جاتا تھا۔

اس زمانے میں کالا قادر سے باہر ایک پرائمری سکول تھا۔ گاؤں سے چند لڑکے پڑھنے کے لئے اس سکول میں جایا کرتے تھے۔ صاحب زادہ خاں ایک معمولی کسان تھے۔ وہ اس حیثیت میں نہیں تھے کہ اپنے بیٹے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کے لئے سکول کے اخراجات برداشت کر سکتے۔ جب سلطان محمد خاں پانچ برس کو پہنچے تو روایت کے مطابق انھیں علم حاصل کرنے کے بجائے روٹی کمانے کا ہنر دیا گیا۔ دیہات والوں نے انھیں موشی چرانے کا کام سونپ دیا اور اس خدمت کے عوض ان کی روٹی کا خرچہ اٹھالیا۔

حسب معمول سلطان محمد خاں ریوڑ لے کر دیہات سے باہر نکل جاتا، وہ کھیتوں میں گلہ بانی کرتا، مویشی گھاس چرتے اور وہ کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر سکول میں طلباء کو حیرت سے دیکھتے۔ ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ پھر ایک دن وہ مویشیوں کو کھیتوں میں چرتے چھوڑ کر سکول چلے گئے۔ استاد نے گدڑے بچے کو دیکھا جو اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ سلطان محمد خاں نے انتہائی جرأت کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ دی کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ اس کی علم کی طلب سے متاثر ہو کر بولا روز آجایا کرو۔ دوسرے دن صبح سویرے سلطان محمد خاں نے مویشی جمع کیے۔ جانوروں کو چرنے کے لئے کھیتوں میں چھوڑ کر وہ علم حاصل کرنے کی غرض سے سکول میں داخل ہو گیا۔ وہ پڑھتا رہا اور مویشی بھی چراتا رہا۔ بڑے شوق سے اس نے پرائمری کا امتحان دیا وہ اوّل آیا اور وظیفہ بھی جیت لیا۔

نتیجہ سے اس کے اندر علم حاصل کرنے کی پیاس مزید بھڑکی اور آگے پڑھنے کا ارادہ کر لیا مڈل سکول اس کے گھر سے دور مدّ وگاؤں میں تھا۔ اس کے لئے مسئلہ تھا کو اگر وہ سکول میں داخل ہوتا ہے تو مویشی نہیں چرا سکتا اور اگر مویشی چراتا ہے تو مڈل سکول میں داخلہ ممکن نہیں ہے بالآخر اس نے وظیفہ میں ملنے والی رقم مبلغ دو روپے اپنے گھر والوں کو دینے کا وعدہ کر

کے اپنے والد کو اسے سکول میں داخل ہونے پر راضی کر لیا پھر گاؤں والے بھی راضی ہو گئے۔ اس نے مڈل کے امتحان میں بھی امتیازی پوزیشن حاصل کی۔

ان دنوں پورے علاقے میں کوئی ہائی سکول نہیں تھا۔ ان کے ذہن میں اور ان کی قسمت پر پھر کالے بادل چھا گئے۔ نہ جانے کیسے انہوں نے معلوم کر لیا کہ لاہور شہر کے موچی دروازہ میں ایک ہائی سکول ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک چینیوں والی مسجد ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے حجرے بھی ہیں جہاں غریب طلباء اور مساکین مسافروں کو رہائش اور روٹی مفت مل جاتی ہے۔ ارادے کے پکے سلطان محمد خاں نے باجرے کی روٹی، گڑ اور چند کتابیں تھیں باندھا اور موچی دروازے کی چینیوں والی مسجد میں پہنچ گئے۔ ان کی اطلاع صحیح تھی۔ انھیں حجرے میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ بقول ڈاکٹر ایوب مرزا:

''مسافر آتے جاتے رہتے تھے مگر یہ نیا مسافر تو مستقل مسافر تھا''[۲]

امام مسجد نے اس کی ذہانت اور علم حاصل کرنے کی لگن سے متاثر ہو کر اسے ہائی سکول میں داخلہ دے دیا۔ وہ نماز باقاعدگی سے پڑھتا اور قرآن کی تلاوت خوش اسلوبی سے کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے موچی دروازہ کا سارا محلّہ ان کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ وہ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد ریلوے اسٹیشن چلا جاتا۔ وہاں دیر تک قلی گیری کرتا تھا اور پھر اس سے جو پیسے ہاتھ آتے تھے وہ انھیں اپنے گھر والوں کو بھیج دیتا۔ سلطان محمد خاں بہت حد تک مطمئن تھے ایک طرف وہ اپنا مقصد حاصل کر رہے تھے۔ پھر ایک روز اسی مسجد میں افغان کونسلر سردار محمد امیر خاں جمعہ کی نماز پڑھنے آیا تو سلطان محمد خاں کی فارسی اور انگریزی زبانیں بولنے کی صلاحیت سے بہت خوش ہوا۔ افغان کونسلر سرہند شریف والے سیّد احمد شہید کا بہت معتقد تھا۔ والی افغانستان امیر عبدالرحمٰن خاں بھی ایک سال عرس کے موقع پر سرہند شریف آئے تھے۔ ایک مرتبہ کونسلر سردار امیر محمد خاں کو اپنے ساتھ سرہند شریف لے گئے۔ بعد میں بھی کئی مرتبہ وہاں خود گیا۔ ایک بار وہ کونسلر کے ساتھ سرہند شریف کے مسجد میں

نماز ادا کر رہا تھا کہ اس پر بے ہوشی کا عالم طاری ہوا۔ خواب کی سی کیفیت تھی کہ سرہند شریف والے کہہ رہے ہیں تو ایک روز افغانستان کا وزیر بنے گا۔ جب ہوش آیا تو وہ اپنی قسمت پر مسکرایا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے قسمت بھی انہی لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جو اپنی قسمت کی لکیریں خود بناتے ہیں۔

افغان کونسلر سردار امیر محمد خاں کو اچانک افغانستان وہ سلطان محمد خان کو اپنے ساتھ لے گیا، جہاں ان کی ملاقات والیِ افغانستان امیر عبدالرحمٰن سے کرائی۔ سلطان محمد خان کو دربار میں مترجم کی نوکری سے بھی نوازا گیا۔ پھر وہ عبدالرحمٰن کے تمام خط و کتابت کا فریضہ سرانجام دینے لگا اور امیر عبدالرحمٰن نے اپنے دربار کا میر منشی (چیف سکریٹری) مقرر کر دیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سلطان محمد خان کی قسمت کھلتی گئی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس کی شادی اپنی بھتیجی سائر جان بنت سردار محمد رفیع خان سے کرائی۔ شادی کے دو برس بعد سائر جان کا انتقال ہو گیا۔ وہ کابل سے پانچ میل دور ایک مقام بنام بدھ خاک میں مدفن ہیں۔ انھیں ایام میں سلطان محمد خان کے خلاف مخالفت نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ دربار میں اور بھی بہت لوگ تھے جو سلطان محمد خان کو اس عہدے سے ہٹانا چاہتے تھے اور انھوں نے اس کے خلاف امیر عبدالرحمٰن کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ مگر امیر ان پر اتنا خوش تھا کہ کوئی کچھ نہ کر سکا۔ پھر اسی دربار میں ایک انگریز خاتون لیلیز ہملٹن (Dr. Lilies Hamilton) تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کی بھانجی تھی اور سلطان کی حمایت بھی کرتی تھی۔ اس نے سلطان محمد خان کو بادشاہوں پر اعتماد نہ کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ مستقبل کی فکر کی جائے۔ سلطان محمد خان کے پاس کافی دولت جمع ہو چکی تھی اور اس خاتون نے اس کی دولت لندن کے ایک بنک میں اپنے نام سے جمع کروادی تا کہ مصیبت کے وقت کان آ سکے۔

سلطان محمد خان افغانستان کے سفر پر روانہ ہوتے وقت گاؤں کے امام بخش نامی آدمی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ چوکیدار تھا۔ اس نے حالات کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ کچھ گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ لہذا رات کو انہوں نے لباس بدلے، دو گھوڑے لیے

اور ہندوستان روانہ ہو گئے اور ہندوستان پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے لاہور کا سفر اختیار کر لیا اور جب لاہور میں انگریزوں کو معلوم ہوا کہ خان بہادر بغیر کسی اطلاع کے آ گئے تو چند ہی روز میں انھیں افغانستان کا جاسوس سمجھ کر جیل میں بند کروا دیا گیا اور ادھر امیر عبدالرحمٰن حیران تھے کہ خان بہادر نے یہ کیا کر دیا۔

ان کی خواہش تھی کہ وہ واپس افغانستان آ جائیں۔ سلطان محمد خان کمال کے بہادر انسان تھے۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح مس لیلیز ہیملٹن سے لندن میں رابطہ کیا اور اس خاتون نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے آزاد کروا دیا اور پھر خان صاحب نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے لندن کا سفر کر لیا۔ خان صاحب نے لندن پہنچتے ہی کیمبرج میں داخلہ لے لیا اور مس لیلیز ہیملٹن نے ان کا سارا پیسہ واپس کر دیا۔ اب انھیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ امیر افغانستاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ خاں بہادر لندن میں مقیم ہیں اور اپنی تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے ہیں تو انھیں لکھ بھیجا کہ اگر کابل نہیں آنا چاہتے تو تم افغانستان کے سفیر کے عہدے کو قبول کر کے ہمارے نمائندے کی حیثیت سے سرکار انگلشیہ سے رابطہ قائم کر لو۔ لہذا اب وہ سفیر کے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ یہ ڈیوک آف ونڈسر کے ساتھ جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم ہو کر تخت نشین ہوا، پولو بھی کھیلتے تھے۔

کیمبرج سے فارغ ہوتے ہی سلطان محمد خان نے بیرسٹری شروع کر دی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب علامہ اقبال، سر شفیع، سر فضل اور سر عبدالقادر وہاں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ لوگ تو محض طالب علم تھے لیکن خان صاحب کے پاس جمع شدہ دولت کے علاوہ انھیں افغان حکومت سے باقاعدہ تنخواہ بھی ملتی تھی۔ انہوں نے سہولت کے ساتھ بیرسٹری پاس کر لی۔ بعد میں فیلو آف دی رائل جیوگرافیکل سوسائٹی بھی ہو گئے تھے۔

انھوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس اپنے وطن کو ترجیح دی۔ وہ لندن سے جہلم پہنچے یہاں پر انھوں نے وکالت شروع کر دی۔ سلطان محمد خان تیرہ برس افغانستان کے امیر کی ملازمت کے بعد واپس ہندوستان آئے۔ جہلم میں

قیام کیا۔فرنگی حکومت نے انھیں سرگودھا اور منٹگمری میں زمینیں دیں۔وہاں ان کے گھوڑی پال (سرکاری) فارم تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد سلطان محمد خاں نے اپنے خاندان کو افغانستان بلوالیا۔امیر افغانستان نے انھیں کابل سے ساز وسامان، غلاموں، کپڑوں اور چالیس باوردی سپاہیوں کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔یہ سپاہی اس قافلے کو لنڈی کوتل (درۂ خیبر) تک حفاظت سے پہنچا کر واپس کابل چلے گئے تھے۔

جہلم میں خان صاحب کی پریکٹس نہ چل سکی اور انھوں نے سیالکوٹ کا رخ کیا وہاں ان کی پریکٹس خوب چلی۔دو سال بعد دوستوں اور رشتہ داروں کے اصرار پر سلطان محمد خان نے پھر سے شادی کر لی۔ چودھری عدالت خاں کی بیٹی سلطاں فاطمہ سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ان کے ہاں طفیل احمد خاں کی پیدائش کے تین برس بعد فیض احمد خاں پیدا ہوا تھا اور فیض کا چھوٹا بھائی عنایت خاں اسی ماں سے تھا۔ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب کے والد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

بقول ایوب مرزا:

> ''چودھری صاحب شہر کی تقریباً ہر انجمن کے صدر تھے۔وہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر، انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر اور انجمن حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے اہم سرکردہ رکن تھے۔ بہبود اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ان کا خاصا تھا۔کئی اسکولوں اور مساجد کو باقاعدگی سے مالی امداد مہیا کرتے تھے۔انھوں نے اپنے وسائل سے کالا قادر میں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔ان کا شمار علاقے کے رؤسا میں ہونے لگا تھا''[۳]

سلطان محمد خاں نے والیِ افغانستان امیر عبدالرحمٰن کی سوانح حیات بھی لکھی تھی۔ وہ افغانستان کے دستوری آئین کے بھی مصنف ہیں اور انھیں خان بہادر کا خطاب بھی مل چکا تھا۔چوہدری سلطان محمد خان چند محنت کش انسانوں میں

سے تھے۔ڈاکٹر لیلیز ہملٹن نے سلطان محمد خان پر ایک ناول ''The Wazir's Daughter'' (وزیر کی بیٹی) لکھا۔فیض صاحب ابھی کالج میں تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔فیض صاحب کو معلوم ہوا کہ ان کے والد مقروض تھے۔گھر میں خوشحالی اور روپے کی ریل پیل مفلسی میں تبدیل ہو گئی کیونکہ ان کے والد جتنا کماتے تھے اس سے بڑھ کر خرچ کرتے تھے۔بقول فیض:

> ''بھائی نہ مانے۔کہنے لگے یہ نہیں ہو سکتا۔اپنی شریفانہ جبلّت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے فیض کو تسلی دی کہ ہم یہ سارا قرض چکا دیں گے۔پھر جائیداد بکنا شروع ہوئی اور قرض اترنا شروع ہوا۔بالآخر سارا قرض اتر گیا اور اس کے ساتھ ہی مرحوم خان بہادر چوہدری سلطان محمد خان کا گھرانہ غربت کی گھاٹی اتر کر مفلسی کے دور میں داخل ہو گیا''[۴]

فیض یتیم ہو چکا تھا۔اس کے گھر پر مصیبتوں اور پریشانیوں کے پہاڑ ٹوٹے لیکن فیض صاحب اور ان کے گھر والوں نے اس مشکل وقت پر قابو پا لیا تھا۔

فیض احمد فیض: پیدائش، بچپن اور تعلیم

۱۳فروری ۱۹۱۱ء کو نارووال کے چھوٹے سے قصبہ کالا قادر میں خان بہادر چوہدری سلطان محمد خان کی بیگم کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔عام رواج کے مطابق نومولود کے کانوں میں اذان کی آواز دی گئی۔سلطان محمد خان نے اپنے بیٹے کا نام فیض احمد خان رکھا۔فیض احمد خان اپنے سگے بڑے بھائی طفیل احمد خان کی پیدائش کے تین سال بعد پیدا ہوا تھا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں:

''وہ پیدائش کے وقت خوب موٹا تازہ اور سرخ و سفید تھا۔ نومولود کی خوشی میں

شہنائیاں بجیں، مٹھائیاں بٹیں اور نذر و نیاز میں بکرے قربان کیے گئے تھے''۔۵

فیض کی تاریخ پیدائش کے بارے میں تصدیق ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے جو معلومات دی تھی وہ ٹھیک ہیں۔ افکار کے فیض نمبر کی اشاعت کے موقع پر ۱۶ اپریل ۱۹۶۵ء کو انہوں نے اس کے مدیر صہبا لکھنوی کے نام لکھا تھا:

''تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷ جنوری ۱۹۱۱ء اور کہیں ۷ جنوری ۱۹۱۲ء

بھی درج ہے۔ میں نے حال ہی ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیال کوٹ

کے بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات کا ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ پیدائش معلوم کرنے

کی کوشش کریں۔ ان کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء

تاریخ پیدائش درج ہے''۔۶

فیض کی والدہ ایک قریبی قصبہ جسڑ (تحصیل نارووال) کے متمول زمیندار گھرانے کے بڑے چوہدری عدالت خان کی بیٹی تھی۔ چھوٹا قد، صاف نکھری ہوئی رنگت والی سلطان فاطمہ ذہین اور ہوشیار خاتون تھیں۔ وہ پڑھی لکھی تھیں اور خوبصورت خطوط لکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ فیض انہیں سب سے زیادہ پیارا تھا۔ فیض کی والدہ عادتاً خاموش طبعیت کی مالک تھیں۔ وہ باقاعدہ عبادت گزار بلکہ تہجد گزار بھی تھیں۔

فیض کی والدہ نے صبر و تحمل سے گھر کو سنبھالا۔ وہ سگے اور سوتیلے بچوں میں کوئی فرق نہیں روا رکھتی تھیں۔ سب کے ساتھ محبت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ اپنے والد کی شادیوں سے متعلق فیض صاحب نے ڈاکٹر ایوب مرزا سے باتیں کرتے ہوئے کہا:

''اپنے آبائی گاؤں کے قریب ایک گاؤں کی رئیس زادی سے شادی کی۔ یہ اب کی

پانچویں شادی تھی۔ باقی بیویاں تو مرکھپ گئیں۔ ہم اس آخری ماں کے بطن سے پیدا

ہوئے''۔۷

برخلاف اس کے ایک اور موقع پر انہوں نے پاکستان کے ممتاز صحافی آئی اے رحمان کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا

''ہماری پرورش ایک متوسط گھرانے کے بچوں کے طور پر ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ

چھوٹی سی عمر میں اپنی دیہاتی روایتوں سے واقف ہو گیا۔ اپنی والدہ سے میں نے

صبر تحمل اور درگزر کا سبق لیا۔ میری والدہ میرے والد کی تیسری بیوی تھیں''۔۸

مختلف لوگوں نے سلطان محمد خان کی بیویوں کی تعداد مختلف بتائی ہے۔ کہیں پر تین تو کہیں پر پانچ لکھی ہیں لیکن اس بات کی تائید ہو جاتی ہے کہ سلطان فاطمہ فیض کے والد کی تیسری بیوی تھیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں جب فیض چار پانچ برس کا ہوا تو ہوش سنبھالتے ہی اس کی تعلیم کا آغاز قرآن پاک کو حفظ کرنے سے کی گئی۔ اس مقصد کے لئے باقاعدہ حافظ قرآن مقرر کیا گیا۔ فیض بآسانی سپارے حفظ کرتا گیا۔ اسے قراءت خوانی کی بھی تربیت دی گئی۔ بقول ڈاکٹر ایوب مرزا:

''شومئی قسمت! فیض تین سپارے حفظ کر چکا تو اس کی آنکھیں دکھنے آگئیں۔ اس

زمانے میں دکھتی آنکھوں کا کوئی معقول علاج دریافت نہ ہوا تھا۔ آنکھوں کی بینائی

کی خاطر فیض کا قرآن پاک کو مزید حفظ کرنے کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ فیض کو قرآن

پاک حفظ نہ کرنے کا عمر بھر قلق رہا''۔۹

فیض کے والد سیالکوٹ کی انجمن اسلامیہ کے صدر تھے۔ ہر سال انجمن کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مسلم مشاہیر اور مقتدر راہنما بطور خاص شریک ہوا کرتے تھے۔ انجمن کے ایک اجلاس میں علامہ اقبال مہمان خصوصی تھے۔

اجلاس کے شروع ہوتے ہی کم عمری کے باعث فیض کو قراءت کے لیے بلایا گیا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اٹھا کر میز پر کھڑا کیا۔ فیض نے بڑی خوشی سے تلاوت کی۔

علامہ اقبال نے فیض کو بلا کر شاباش دی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ یوں فیض نے پہلی بار لوگوں سے کامیابی سے مخاطب ہوا اور اس نے داد بھی پائی۔ فیض کے گھر میں فارسی بولی جاتی تھی۔ فیض کی پرورش اور دیکھ بھال نانا جان کرتی تھی۔ نانا جان کو کہانیاں سنانے کا شوق تھا۔ ڈاکٹر صلاح الدین حیدر بھی لکھتے ہیں:

''فیض نے جب ہوش سنبھالا تو اس کے باقاعدہ آغاز سے پہلے فیض کو گھر کی منتظمہ

بابا جان سے فارسی کے قصص و حکایات سننے کا موقع ملا'' ۱۰

فیض کی سب سے بڑی بہن بی بی گُل نے اس کی سوتیلی ماں سائر جان سے تھی۔ بی بی گل نے گھر پر ہی مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کو پڑھانے ایک استانی روزانہ ان کے گھر آیا کرتی تھی۔ وہ بتاتی ہیں کہ فیض اپنی ماں کی طرح بچپن ہی سے صبر و تحمل اور خاموش طبعیت والا انسان تھا۔ ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنے یا گھومنے کبھی گلی کوچوں میں نہیں گیا تھا۔ فیض کو پہلی بار سکول میں بٹھانے کے لیے بہت سے انتظام کیے گئے۔ اس کو مخملی لباس زیب تن کیا گیا۔ اس کے بال سنوارے گئے۔ اس کی تیاری میں نہ جانے کتنے ناز و نخرے اٹھائے گئے۔ اسی حوالے سے احمد سلیم لکھتے ہیں:

''جب پہلے دن ہمیں جانا تھا سکول تو ہماری بڑی بہنوں نے ہم کو تیار کیا سکول

جانے کے لئے مخمل کے کپڑے ہم کو پہنائے گئے۔ سرخ رنگ کی واسکٹ تھی اور

ویسی ہی نیکر اور ریشمی موزے اور بہت بڑھیا قسم کے جوتے اور کڑھی ہوئی ٹوپی تو

جناب یہ پہنا کر ہم کو بھیجا گیا سکول۔'' ۱۱

ہم نے تو سکول کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب وہاں گئے تو دیکھا کسی بچے کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، کسی کے پاؤں

میں جوتا نہیں ہے۔ جب ہم کلاس میں پہنچے تو سب نے ہماری طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی جانور آ گیا ہو کلاس میں۔ اس وقت فرش پر ٹاٹ بچھا ہوا ہوتا تھا۔ پھر اگلے دن ہم بھی انہیں کی طرح کے کپڑے پہن کر سکول میں گئے۔ ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے جس سے یہ لگے کہ ہمارے پاس بہت دولت ہے۔ آخر کار فیض نے ان عوامی بچوں سے ہار مان لی۔ ایک دن اپنے ابا سے کہہ ڈالا ''ہم اس اسکول میں نہیں پڑھیں گے''۔ پھر فیض کو فوری طور پر اسکاچ مشن سکول (سیالکوٹ) میں داخل کروا دیا گیا۔

مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی اپنے دور کے بڑے عالم، اور صاحب علم شخصیت مانے جاتے تھے۔ وہ مختلف جماعتوں کے طلباء کو ایک ہی وقت میں درس دیا کرتے تھے۔ فیض نے ابتدائی علم انہی سے لیا۔ قرآن و حدیث کا درس بھی انہی سے لیا۔ فیض اپنے استاد کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس سکول میں فیض کے دوسرے استاد شمس العلماء مولوی میر حسن تھے علامہ اقبال بھی ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔ فیض نے ان سے چھٹی اور ساتویں جماعت میں عربی کی صرف و نحو پڑھی تھی۔ انہیں مشن سکول بہت پسند آ گیا۔ وہ یہاں کی روزمرہ زندگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ پڑھائی میں ٹھیک تھے اور کھیل کود میں آگے آگے تھا اور پھر کچھ طلباء نے فیض کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا۔ بقول فیض:

> ''لیڈری کی صفات ہم میں نہیں تھیں۔ بھئی اس کے لئے آدمی لٹھ باز ہو کہ دوسرے اس کا رعب مانیں یا وہ سب سے بڑا فاضل ہو۔ ہم پڑھنے لکھنے میں ٹھیک تھے، کھیل بھی لیتے تھے۔ لیکن پڑھائی میں ہم نے کوئی ایسا کمال پیدا نہیں کیا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں''۔[۱۲]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ فیض صاحب نے ہمیشہ عاجزی و انکساری کو اپنایا ورنہ اس میں لیڈری کی صفات تو موجود تھیں وراس کے کمالات کے معیار عوامی سطح سے بلند تھے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا فیض کے بچپن کے بارے میں بات کرتے ہیں اس کے گھر میں ہمیشہ خواتین کا جمگھٹا رہتا تھا۔ بڑے بھائی طفیل احمد خان سب کے لاڈلے تھے اور سب سے چھوٹے بھائی عنایت احمد خان کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ سب فیض کے اردگرد منڈلاتے تھے اور پھر سب لوگوں نے امیدیں لگا رکھی تھیں فیض بڑا ہو کر شریف انسان بنے گا۔ طفیل اور عنایت خواتین سے باغی ہو کر گلی میں کھیلنے چلے جاتے وہ ہر طرح کی طفلانہ کھیل کود میں مشغول رہتے تھے۔ ایسے میں اکیلا فیض خواتین کے ہجوم میں گھرا رہتا۔ ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا اجڑ قسم کے بات اس زمانے میں ہمارے منہ سے نہیں نکلتی تھی، اب بھی نہیں نکلتی۔ نقصان یہ ہوا، جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے کہ بچپن میں کھلنڈرے پن یا ایک طرح کے لہو ولعب کی زندگی گزارنے سے محروم رہے مثلاً یہ کہ گلی میں کوئی پتنگ اڑا رہا ہے، کوئی گولیاں کھیل رہا ہے کوئی لٹو چلا رہا ہے۔ ہم بس کھیل دیکھتے رہتے تھے آگے آنے کی ہمت اس لیے نہ ہوتی کہ اسے شریفانہ شغل یا شریفانہ کام نہیں سمجھتے تھے۔

ان تمام معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیض کے گھریلو ماحول میں ہر طرح کی خواتین، دکھی، بیوہ، یتیم اور بے آسرا خواتین کا گہرا اثر تھا۔ ایسے اثرات کے نتیجہ کے طور پر وہ بچپن ہی سے پُر امن صلح پسند تھا۔ شکوہ و شکایات نہ کرنا فیض کی سرشت میں شامل تھا۔

فیض کے اساتذہ اس پر مہربان تھے۔ اس زمانے میں اساتذہ سخت مزاج کے ہوتے تھے۔ یوں سمجھ لیں جلاد قسم کے تھے۔ سکول میں مار پٹائی کا رواج عام تھا۔ یہ فریضہ فیض کو سونپا ہو تھا۔ یعنی فلاں کو چانٹا لگاؤ، فلاں کو تھپڑ مارو۔ فیض کو اس کام میں کوفت ہوتی تھی۔ بقول فیض:

''بھئی ہم کوشش کرتے تھے کہ جتنا ممکن ہو سکے ایسے سزا دیں کو سزا یافتہ ساتھی کو سزا محسوس نہ ہو۔ طمانچہ کی بجائے گال تھپتھپا دیا یا کان کو آہستہ سے کھینچا''۔[۱۳]

ایسا کرتے ہوئے جب فیض پکڑا جاتا تو استاد غصہ کرتا یہ کیا کر رہے ہو چانٹا ذرا زور سے مارو۔ فیض کو یہ کام پسند نہیں تھا۔ ایک دن تنگ کر اس نے اس سے نجات حاصل کر لی اور اپنے ہندو ساتھی کو اس کام کے لیے راضی کر لیا۔ پھر وہی لڑکا یہ فرائض انجام دیتا رہا اور فیض اس قسم کے بے فیض فریضہ سے آزاد ہو گیا۔ فیض کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی۔ جہاں اس نے لوگوں کو تکلیف دینے کی بجائے غم سہنے کی عادت تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ فیض کے شب و روز کے معمولات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب صبح سویرے ابّا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جایا کرتا تھا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے درس قرآن لیتا۔ جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے۔ پھر ابّا کے ساتھ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے، پھر سکول، رات کو ابّا خط لکھنے کے لیے بلا لیا کرتے تھے۔ ان دنوں انہیں خط لکھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ وہ ابّا کے سیکریٹری کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ اردو انگریزی اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے سے اس کی معلومات اور علمی صلاحیت میں خاصا اضافہ ہوا۔

فیض کے والد ایک گدی نشین درویش صاحب زادہ فیض الحسن کے پاس جاتے تھے۔ وہ فیض کو اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ بقول فیض صاحب زادہ صاحب بڑے اچھے شاعر اور رنگین مزاج تھے۔ داڑھی وغیرہ تو انھوں نے بعد میں رکھی تھی۔ سیالکوٹ میں ان کی بڑی گدی تھی۔ اس کے تقریباً پانچ چھ میل پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں آلو بہار تھا۔ وہاں پر ایک درویش رہتے تھے۔ آلو بہار والے بڑے پیر تھے۔ فیض کا کہنا ہے وہ بڑے پیر نہیں درویش تھے۔ ہم بہت چھوٹے تھے۔ شاید وہاں سے بھی کچھ اثر آ گیا ہو (صوفیانہ قسم کا)

فیض کے والد ڈسٹرکٹ بورڈ سیالکوٹ کے وائس چیئرمین تھے۔ اعلیٰ حکام (کمشنر، کمانڈر ان چیف وغیرہ) ان سے ملنے آیا کرتے تھے تو وہ ایسے موقع پر فیض کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ یوں فیض صاحب زندگی کی منزل طے کرتے رہے اور جب ایوب مرزا نے فیض سے پوچھا ''آپ نے بچپن میں کوئی شرارت دی۔ فیض کہتے ہیں کہ بھئی ان کے رعب اور

دبدبہ اتنا تھا کہ شرارت کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی ذہانت و لیاقت قد کاٹھ اور گونج دار آواز کے ساتھ سارے مجمع پر چھا جاتے تھے۔

فیض مزید بتاتے ہیں کہ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک بار کہنے لگے۔ تم نے شاعری شروع کر دی ہے۔ یہ اچھا کہا ہے۔ ''بس آئی سی ایس۔ توں میرا ناں وڈا کریں گا''۔ اس وقت فیض تھرڈ ائیر میں تھا۔

فیض صاحب کی کتب بینی سے دلچسپی اور شاعری کی ابتداء:

سیال کوٹ میں سلطان محمد خان کے گھر کا ماحول بہت ہی علمی و ادبی تھا اور ظاہر ہے کہ فیض صاحب کی پرورش بھی اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ اس ادبی فضا سے ابتدائی عمر میں متاثر ہو گئے تھے۔ فیض صاحب کو بچپن سے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کے گھر کے ساتھ ہی کتب فروش کی دکان تھی۔ جہاں کتابیں کرایہ پر مل جاتی تھیں۔ اس زمانے میں طلسم ہو شربا، فسانہ آزاد اور مولانہ عبدالحلیم شرر کے ناولوں کی شہرت تھی۔ فیض نے یہ ساری کتابیں پڑھ لی تھیں اور پھر اس کا رخ شاعری کی جانب ہوا۔ اس زمانے میں داغ، میر، غالب کا کلام بھی پڑھ لیا تھا۔

ایک روز اس کے بڑے بھائی طفیل احمد خان کے ایک ہم جماعت نذیر احمد نے اسے سکول میں شاعری کی کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ پوچھا کبھی شاعری بھی کی ہے۔ فیض نے جواب دیا نہیں کبھی نہیں کی۔ نذیر احمد نے اپنے ایک ہم جماعت چھجو رام کی ہجو لکھنے کی فیض سے خصوصی فرمائش کی۔ فیض نے اپنی عقل اور شاعرانہ حیثیت کے مطابق فرمائشی ہجو لکھ دی کہ چھجو رام کا سر ایسا ہے، پیٹ اس طرح کا ہے اور ٹانگیں یوں ہیں، وغیرہ۔

نذیر احمد نے ہجو پڑھی اس سے رہا نہ گیا۔ فوراً کہہ دیا ''تم تو شاعر ہو''۔ اگلے دن سارے اسکول میں اس ہجو کی شہرت کو چار چاند لگے ہوئے تھے۔ مگر فیض شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ اس سے چھجو رام کو دکھ اور تکلیف پہنچی ہو گی۔ وہ تو چھجو

رام کو جانتا بھی نہیں تھا۔ بلکہ فیض نے چھجو رام کو جگہ جگہ ڈھونڈا تا کہ اپنے کیے پر معافی مانگ سکے۔ بلکہ چھجو رام خوشی سے پھولا نہیں سمایا جارہا تھا کہ معافی کیسی میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے سکول میں مشہور کر دیا۔ یہ فیض کی پہلی شاعرانہ تک بندی تھی۔ اس وقت وہ تیرہ برس کا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کو ابتدائی شاعری میں فیض ایسے ہی حالت میں غرق تھا۔ بقول ایوب مرزا:

> ''ایک روز ہیڈ ماسٹر کو خیال آیا لڑکوں کا شاعری کا مقابلہ کرانا چاہیے۔ پھر کیا دیر تھی۔ ماسٹر بہاری لال نے ایک مصرع طرح دیکر سب کو غزل کہنے کی دعوت دی۔ مقابلے کے جج شمس العلماء سید میر حسن تھے۔ فیض نے بھی غزل لکھی، فیض کی طبیعت قدرتاً موزوں تھی، فیض کی غزل کو اوّل قرار دیا گیا۔ شمس العلماء میر حسن خوش ہوئے اور انھوں نے فیض کو ایک تمغہ اور ایک روپیہ بطور انعام دیا۔ فیض کو تمغہ بہت پسند آیا۔ فیض نے تمغہ سدا سنبھال کے رکھا۔ وہ اس انعام کو زندگی بھر یاد کرتا رہا۔ یوں فیض سکول میں مشہور ہو گیا''۔[۱۴]

یہیں سے فیض کی تک بندی کی ابتداء ہوئی ہے خیر یہ تو سکول کے زمانے کی بات تھی لیکن فیض صاحب کی ابتدائی ادبی ترقی کے سلسلے میں نقوش ان کے پڑوس کی حویلی سے بھی ملتے ہیں۔ انہوں نے ابتدائی شاعری کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

فیض کے آبائی گھر سے متصل ایک پُرانی بڑی حویلی تھی۔ وہاں باقاعدہ مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ انہیں سے شہر میں شعرا کی بساط قائم اور آباد تھے۔ منشی راج نرائن دہلوی سیالکوٹ شہر میں مقیم تھے۔ یہ مشاعرے انہی کے مرہونِ منت تھے۔ شہر میں ایک دوسرے بزرگ منشی سراج الدین بھی رہتے تھے۔ وہ کشمیری میر منشی تھے اور علامہ اقبال کے احباب میں سے تھے۔ ان کی ریزیڈنسی کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہوتی تو وہ بھی آجاتے تھے۔ ان کی آمد سے شاعروں کا بازار گرم ہو

جاتا تھا، شاعروں کی روح رواں تھے۔ منشی سراج الدین ہی ان مشاعروں کی صدارت فرمایا کرتے تھے۔ مشاعروں میں مصرع طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ ہر برس پانچ چھ ماہ تک سیالکوٹ شہر میں شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ بیشتر نوجوان اس کی لپیٹ میں رہتے تھے اب اس میں خاموش طبع فیض بھی شامل تھا۔ فیض نے بھی ان شاعروں میں جانا شروع کیا۔ کافی عرصہ تک اسے کچھ سنانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ بقول فیض:

> ''منشی سراج الدین بڑے فقرے باز آدمی تھے۔ شعر سنانے والے نے ایک شعر پڑھا۔ تو منشی صاحب نے اسی مضمون پر اساتذہ کے دس اشعار فوراً سنا دیتے۔ اکثر نومشق نوجوان کو شعر سنانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ فیض بھی انہیں میں شامل تھا۔ بہت دنوں کی داخلی قلبی جنگ اور تگ ودو کے بعد فیض نے ہمت باندھی اور ان کے مشاعرے میں ایک غزل پڑھ دی۔ منشی صاحب سے رکیک کلمات سننے کے لیے فیض ذہنی طور پر بالکل تیار تھا پر ایسا نہ ہوا۔ الٹے منشی صاحب نے داد دی۔ برخوردار یہ تو اچھا ہے۔''[۱۵]

انھوں نے کہا کہ تم بہت تلاش کے بعد شعر کہتے ہو اور یہ کام ابھی چھوڑ دو۔ ابھی پڑھائی پر توجہ دو اور فیض کا کہنا ہے کہ ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں فیض نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور سیالکوٹ کے مرے کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا وہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی اردو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے کالج میں مشاعرے کی طرح ڈالی اور فیض کو مصرع طرح پر شعر کہنے کو کہا۔ فیض نے بھی چند اشعار سنائے جس پر فیض کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے فیض کو منشی سراج الدین کے بالکل الٹ مشورہ دیا۔

ایسے حالات میں فیض نے مرے کالج سے ایف۔ اے کا امتحان فرسٹ دویژن میں پاس کر لیا اور ۱۹۲۹ء میں

گورنمنٹ کالج لاہور میں تھرڈ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ داخلے کے لیے اپنے ابّا کے ہمراہ علامہ اقبال سے ملنے آیا تا کہ اپنے داخلے کے لیے کالج میں فارسی کے پروفیسر قاضی فضل الحق کے نام سفارشی خط لے جا سکے۔ داخلہ ہو جانے کے بعد فیض نے وہ خط واپس لینا چاہا مگر قاضی صاحب نے اسے پاس رکھ لیا تھا۔

فیض کی رومانوی شاعری کی ابتداء گورنمنٹ کالج لاہور سے ہوئی تھی۔

''غم جانان کو سینے میں چھپائے فیض نے اظہار عشق کو اشعار کا جامہ پہنایا۔ حسن گل کی شرح سے آگے بڑھتا گیا۔ اس ضمن میں اسے کالج کے اساتذہ اور ان کی محفلیں بہت راس آئیں۔ وہ شاعری میں نکھرتا گیا۔ (نقش فریادی کا پہلا حصہ گورنمنٹ کالج لاہور ہی کے زمانے کا ہے) شاعری کی باقاعدہ اور باضابطہ ابتداء ہو چکی تھی''۔[۱۶]

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۱۹۲۹ء میں فیض گورنمنٹ کالج لاہور میں تھرڈ ایئر میں داخل ہوا تھا۔ وہ کالج کے لیے نئے، اجنبی ماحول میں اداس، تنہا رہتا تھا۔ کیونکہ وہ دل زدہ جو تھا۔

''فیض فورتھ ایئر (۱۹۳۰) میں تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ فیض نے اپنے دوست شیر محمد حمید کو سیالکوٹ سے لکھا۔ ''تمھارا فیض یتیم ہو گیا ہے''[۱۷]

وہ دور فیض کی زندگی کا مشکل دور تھا۔ کیونکہ ان کے والد اسّی ہزار روپے کے مقروض تھے۔ ان کے والد نے کبھی قرض کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ کئی بار فیض کو بھوکے پیٹ بھی سونا پڑا۔ مگر انھوں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں کالج مشاعرہ ہوا جس میں فیض نے نظم سنائی اور اوّل انعام بھی پایا۔ انہی دنوں فیض اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں آگے آگے تھا۔ علامہ اقبال گول میز کانفرنس کرنے کے بعد واپس آئے تو فیض نے دیگر انجمنوں کے ساتھ اتحاد کر کے

گورنمنٹ کالج کی طرف سے علامہ اقبال کو استقبالیہ بھی دیا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے فیض کو وہی نظم سنانے کے لیے کہا چنانچہ فیض نے پہلی مرتبہ اقبال کے سامنے اپنا کلام سنایا۔ علامہ اقبال کو نظم بہت پسند آئی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض ایم اے میں پہنچا تو اس نے باقاعدگی سے کلاس میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ جب جی چاہا تو چلے گئے اگر نہ چاہا تو نہ گئے۔ فیض نصاب (انگریزی ایم اے) سے ہٹ کر دوسری کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ جب استاد کا (پروفیسر ڈکسن یا پروفیسر ہریس چند کٹا پالیا) لیکچر نہ دینے کا دل کرتا تو وہ فیض سے رجوع کرتے کہ ہماری جگہ پر تم کلاس لے لینا ایک ہی بات ہے اور فیض خوشی خوشی لیکچر دے دیتے۔ فیض امتحان میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ مگر اوّل، دوم آنے والے طلباء سے وہ کہیں زیادہ علم رکھتا تھا۔

ایم اے او کالج، ڈاکٹر رشید جہاں اور فیض:

۱۹۳۵ء میں فیض صاحب کو ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔ اسی دوران ان کی ملاقات صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑنا شروع ہوئی۔ اس وقت جنرل فرانکو کی موجودگی میں سپین پر حملہ ہو چکا تھا۔ اٹلی اور جرمنی فسطائیت کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ یہ زمانہ فیض صاحب کی عاشقی کا تھا اور اس درد سے نجات پانے کا انہیں گر نہیں سوجھ رہا تھا کہ ڈاکٹر رشید جہاں نے ان کے غم کو پہچان لیا تھا اور فیض صاحب کو سمجھایا تھا ''چھوڑو یہ عاشقی کے چکر'' دنیا کے جو غم ہیں ان کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔ بقول فیض

''انہوں نے ہم کو سکھایا کہ اپنا جو غم ہے یہ تو بہت معمولی سی چیز ہے۔ دنیا بھر کے دکھ دیکھو

اور اپنے لوگوں، اپنی قوم اور اپنے ملک کے دکھ دیکھو۔'' ۱۸

ڈاکٹر رشید جہاں نے فیض صاحب کو مارکس / اینگلز کا کمیونسٹ مینی فیسٹو دیا۔ جسے پڑھ کر فیض صاحب پر چودہ

طبق روشن ہو گئے۔ یہیں سے ان کے ذہنی رجحانات تبدیل ہوئے۔ اگر دیکھا جائے تو امرتسر کا زمانہ فیض صاحب کے لیے خوش آئند تھا۔ ایک تو انہیں پڑھانے کا موقع ملا اور امرتسر کا ادبی و سیاسی لحاظ سے کار آمد ثابت ہوا۔

ترقی پسند مصنفین کا آغاز اور فیض صاحب کی شمولیت:

ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز اس وقت ہوا جب عالمگیر کساد بازاری کی وجہ سے دنیا شدید ترین اقتصادی بحران کا شکار تھی۔ اس بحران کی وجہ سے ہندوستان کی نوآبادیاتی معیشت کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی چنانچہ یہ وہ دن تھے۔ جب لوگ معاش کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے یہ تو ملک کے حالات تھے اور دوسری طرف یورپ میں فاشزم کا دیو خون اور آگ کی جنگ لڑ رہا تھا۔ ہٹلر نے جرمنی میں اقتدار سنبھالتے ہی جمہوریت پسند سیاست دانوں اور روشن خیال ادیبوں، مفکروں اور سائنس دانوں پر زندگی تنگ کر دی تھی اور ان کو جیل میں بند کر دیا تھا جو جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے سوویت روس اور امریکہ میں پناہ لی۔ اس سلسلے میں سبط حسن لکھتے ہیں کہ ارنسٹ ٹولر، سٹیفان زوائگ، تھامس مان، فرائڈ مان اور آئن سٹائن سب کو ملک بدر کر دیا گیا۔ اسی دور میں مسولینی نے حبشہ پر حملہ کر دیا اور اس حملے کے رد عمل کے طور پر مجلس اقوام میں شور مچا چونکہ مسولینی کو برطانوی اور فرانسیسی حکومت کی حمایت حاصل تھی لہذا ان پر مشرق کے پسماندہ ملک کی فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر کار مسولینی حبشہ پر قابض ہو گیا تھا۔ ان حالات نے دنیا بھر کے روشن خیال ادیبوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آزادی اور جمہوریت کے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں برطانیہ، امریکہ ہر طرف ادیبوں کی تنظیمیں بننے لگیں اور اس کے ساتھ ہی ادیبوں میں اپنی سماجی ذمے داریوں کے حوالے سے احساس بھی بڑھنے لگا۔ ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، سید سجاد ظہیر اور ڈاکٹر جیوتی گھوش نے لندن میں ایک منشور پر متفق ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۶ء کی ایک شام سجاد ظہیر لندن سے پہنچے تو محمود الظفر سے ملاقات کے لیے امرتسر آئے اور

یہاں ان کی ملاقات فیض صاحب سے ہوئی۔ اسی ملاقات میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کرنے پر تبادلہ خیال بھی ہوا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ لاہور ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھا اور لاہور کے بیشتر شاعر اور لکھنے والے فیض صاحب کے جاننے والے تھے چنانچہ جنوری ۱۹۳۶ء فیض صاحب سجاد ظہیر، محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں کو ساتھ لے کر لاہور آئے اور میاں افتخار الدین کے گھر پہنچے۔ اس سلسلے میں احمد سلیم لکھتے ہیں ایک تو ڈاکٹر ایوب مرزا نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے اور بہت سی معلومات بھی مل جاتی ہیں۔ بقول احمد سلیم:

> ''۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا آغاز ہوا تو امرتسر اور لاہور فیض اس کے پرجوش بانیوں میں تھے۔ جنوری ۱۹۳۶ء میں وہ سجاد ظہیر کو لے کر لاہور آئے اور جب وہاں سے لوٹے تو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ساحر لدھیانوی اور احمد ندیم قاسمی سمیت درجن بھر ادیبوں کا فعال حلقہ انجمن سے جڑ چکا تھا۔''[۱۹]

انجمن کی پہلی کل ہند کانفرنس اسی سال لکھنو میں قائم ہوئی۔ جہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے ۱۹۳۶ء میں ایک نظم لکھی جو ہندوستان کے آزادی پسند نوجوانوں کا نعرہ بن گئی تھی۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

لاہور میں صوفی تبسم صاحب کے چلے جانے کے ساتھ ہی انجمن بھی ختم ہوگئی۔ لاہور میں ایک پنجاب لٹریری لیگ ہوتی تھی۔ اس لیگ کے ایک ممبر کشمیری بنڈت شنگلو جی تھے۔ اس لیگ کے لوگوں نے انجمن کے ساتھ کافی تعاون کیا۔ بقول فیض اب اس انجمن کے اجلاس وہیں ہونے لگے۔ لیکن جلد ہی یہ لیگ کوچ کر گئی۔ انجمن ایک بار پھر دفتر سے محروم ہو کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگی۔ لاہور میں ایک بنگالی ہندو سانیال نام کے تھے۔ ان کا پینٹنگ کا اسٹوڈیو تھا۔ انہوں نے انہیں

اپنے ہاں جگہ دے دی۔ اب اس انجمن کے اجلاس وہیں ہونے لگے۔ فیض کہتے ہیں اس دربدری میں ہم سب کی ہمت جواں تھی

ایلس کیتھرین جارج سے ملاقات اور شادی:

ایلس جب لندن سے اپنی بہن اور بہنوئی سے ملنے امرتسر آئی تو یہاں پر ان کی ملاقات فیض صاحب سے بھی ہوئی اور یہ ملاقات بعد میں عمر بھر کی رفاقت میں تبدیل ہوگئی۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے فیض صاحب نے کہا:

> ''بھئی یہ کوئی ایسے ہی تو آن فرسٹ سائیٹ کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے ایلس اور فیض تقریباً دو برس تک ایک دوسرے سے ملتے اور سمجھتے رہے۔ دراصل دونوں ایک ہی نوع کے نظریاتی مسلک اور سیاسی رنگ میں رنگے جا چکے تھے اور فیض کے لیے شادی جیسا کٹھن معاملہ خیالات کی ہم آہنگی اور دل خوش کن پیوندکاری سے آسان ہوگیا تھا''۔[۲۰]

ایلس اور فیض صاحب دونوں کے نظریات میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ فیض کی طرح ایلس بھی روشن خیال خاتون تھیں کیونکہ فیض صاحب نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ وہ ایلس سے ہی شادی کریں گے۔ ان کی والدہ کی خواہش تھی کہ ایسی لڑکی آئے جو زیادہ پڑھی لکھی نہ ہو اور وہ ان کی خدمت کرے۔ آخر کار فیض صاحب کی والدہ ایلس سے شادی کے لیے مان گئی تھیں۔

ایلس کا اسلامی نام کلثوم رکھا گیا اور فیض اور ایلس کا نکاح شیخ محمد عبداللہ نے ۱۲۸ اکتوبر ۱۹۴۱ء کے سری نگر میں پڑھایا جو ایک یادگار واقعہ تھا۔ زندگی کا یہ ایک اہم فیصلہ تھا جو ان دونوں نے مل کر کیا تھا اور جس کے اثرات ان کی زندگی پر بھی

پڑے۔۱۹۴۳ء میں ان کی پہلی بیٹی سلیمہ کی پیدائش ہوئی اور ۱۹۴۵ء میں دوسری بیٹی منیزہ پیدا ہوئیں۔زندگی کی مشکلات اور سیاسی جدوجہد کے سفر میں ایلس نے فیض صاحب کا ساتھ جس حوصلہ مندی سے دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔جس طرح فیض صاحب نے جیل کے زمانے سے ایلس کو جو خطوط لکھے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایلس نے ہمت اور جرات کے ساتھ فیض صاحب کا ساتھ دیا اور فیض صاحب کو اپنی دونوں بچیوں سے بے حد پیار تھا۔جیل کے زمانے میں فیض صاحب نے لکھے گئے اپنے خطوط میں ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت یاد کیا اور انہیں اس بات کا بھی دکھ تھا کہ وہ اپنی بچیوں کو اپنے سامنے بڑا ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

فیض احمد فیض کے سوشلسٹ نظریات:

فیض صاحب کے سوشلسٹ نظریات بالکل واضح تھے۔وہ سوشلزم کو آب حیات نہیں سمجھتے تھے جسے پی کر ہر ملک اور ہر مقام کے عوامی مسائل کو حل کیا جائے۔ان کی نظر میں سوشلزم ایک طریقہ کار تھا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے فیض صاحب بتاتے ہیں کہ سوشلزم ایک طریقہ کار ہے۔وہ تو ایک نظریاتی سیاسی اور اقتصادی لائحہ عمل ہے ایک پورا نظام ہے اور پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے بارے میں فیض صاحب بتاتے ہیں کہ نام سے کیا ہوتا ہے جہاں اسلام ہوگا وہاں سوشلزم اسلامی ہوگا اور جو ملک اسلامی نہیں ہوگا وہاں خالصتاً سوشلزم ہوگا پاکستان اسلامی ملک ہے تو بنیادی اصول بھی اسلامی ہوں گے۔

فرنگی فوج کی نوکری اور فیض احمد فیض:

۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو برطانوی نوآبادیات ہونے کی وجہ سے ہندوستان کو بھی اس جنگ

کی آگ میں جھونک دیا۔ یوں ہندوستان ایک مشکل دور سے گزر رہا تھا انہی دنوں فیض صاحب کا کیمبرج میں داخلہ بھی ہو چکا تھا وہ روانہ ہوتے ہوتے رہ گئے اور اس دوران جنگ کا طبل بجا اور ان کی روانگی منسوخ ہوگئی۔ ساتھ ہی ۱۹۴۰ء میں دانیال لطیفی نے بی بی سی لندن کی نوکری کی پیشکش کی۔ چونکہ ملک کے حالات اتنے خراب تھے کہ فیض صاحب نے کسی اور نوکری کو قبول کرنے کی بجائے ۱۹۴۰ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں پڑھانے کو ترجیح دی۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے احمد سلیم اپنی کتاب میں لکھتے ہیں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کرنے اور کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں خاص طور سجاد ظہیر سے قریبی تعلقات اور ٹریڈ یونین میں اہم رکن کی حیثیت سے برطانوی خفیہ پولیس کی نظر میں آگئے اور پھر نہ صرف فیض صاحب بلکہ بہت سے ترقی پسند نوجوان سوویت یونین کے اشتراکی نظریات سے بے حد متاثر تھے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے کہا کہ ہمیں حقیقت پسندانہ ادب تخلیق کرنا ہے۔ فرنگیوں کی مدد نہیں کرنی اور انہوں نے برطانوی حکومت کا بائیکاٹ کر دیا۔ پھر کیا ہوا کہ پورے ملک میں ترقی پسندوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں جب ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تو سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں نے سوویت یونین کے دفاع کو اہمیت دی اور کہا کہ سوویت نونین کی بقا کے لیے فاشزم کے خلاف جنگ کرنا بہت ضروری ہے۔ پہلے اس جنگ کو سامراجی جنگ کہا گیا تھا اب یہ ''پیپلز وار'' بن چکی تھی۔ یہی وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے فیض صاحب نے کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ کیونکہ مجید ملک فیض صاحب سے پہلے برطانوی فوج میں شمولیت اختیار کر چکے تھے۔ بقول ایوب مرزا:

''انہوں نے پکارا فیض تمہاری بڑی ضرورت ہے۔''[۲۱]

فیض صاحب نے ۱۹۴۲ء میں برطانوی فوج کے شعبہ تعلقات عامہ میں بحیثیت کپتان بھرتی ہوئے۔ تو یہ زمانہ

فاشزم کے خلاف عالمی سطح پر بھرپور مزاحمت کا تھا اور یہ رائے دی جارہی تھی کہ اگر ہٹلر کی فوجوں نے روس پر اپنی فتح حاصل کر لی اور جاپانیوں کو ایشیاء اور خاص طور پر ہندوستان کے محاذوں پر کامیابی غاصل ہوگئی تو برصغیر بھی غلامی کی دلدل میں ڈوب جائے گا۔لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا برصغیر آزاد تھا۔؟ جسے فاشزم کے خطرے سے بچایا جارہا تھا۔لیکن برطانوی فوج میں شامل ہونے کے بارے میں فیض صاحب کوئی انٹرویو دیا ہے تو ان کا نقطہ نظر واضح تھا اور یہ نقطہ نظر وہی تھا جو ترقی پسند قوتوں کا تھا یعنی فاشزم کے خلاف جنگ اور فیض صاحب نے جنگ میں شامل ہو کر اپنے اس نقطہ نظر سے انصاف کیا تھا۔اس سے ہمیں صاف پتہ چل جاتا ہے کہ انہوں نے برطانوی فوج میں کیوں شمولیت اختیار کی ۔ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا

> ''دوسری جنگ عظیم سے پہلے جب یورپ میں ہٹلر اور مسولینی کی قیادت میں نازی اور فاشسٹ تحریکوں نے زور پکڑا تو دنیا بھر کے باشعور دانشور جن میں ہندوستان کے ترقی پسند ادیب بھی شامل تھے اس عالم گیر خطرے کی مخالفت میں کمربستہ ہوئے۔لیکن سامراجی طاقتیں برطانیہ،امریکہ وغیرہ اس طوفان کو روکنے کی بجائے ہٹلر مسولینی کو شہ دیتی رہیں اور فاشزم کا دیو ایک ایک کر کے کمزور ملکوں کو ہڑپ کرنے لگا۔ایتھوپیا، اسپین، آسٹریا، چیکوسلواکیہ ختم ہو چکے تو ان سامراجی اور سرمایہ دار ملکوں کا خیال تھا اب یہ ریلا سوویت روس کی جانب رخ کرے گا۔اور یوں ان کے نظام کے اصل حریف سوشلزم کا نام صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔یہ چال الٹی پڑی اور ان کے گھر کو اپنے ہی چراغ سے آگ ہی لگ گئی۔''۲۲

شروع میں تو یہ جنگ دو سامراجی طاقتوں کے درمیان تھی۔ہمارا اس سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا لیکن

فاشسٹ فوجیں ادھر مغرب میں یورپ کو محفوظ رکھتے ہوئے افریقہ میں تباہی مچاتی ہوئی مصر کی سرحد تک جا پہنچیں ور دوسری طرف سوویت روس کے بہت سے علاقوں کو روندتے ہوئے قفقاز تک پہنچ گئیں اور جاپانی فاشسٹ بھی جنگ میں کود پڑے اور برما کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان میں داخل ہو گئے۔ بلکہ اس جنگ کے شعلوں کی آنچ بھی ہم نے اپنے گھر میں محسوس کی۔ اپنے وطن کے دفاع اور انسانی تہذیب کی بقا کے لیے فاشزم کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ اسی وجہ سے ہم نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔

فیض صاحب کے ذمے مختلف محاذوں پر ہندوستانی سپاہیوں کے لیے پبلک ریلیشنز یا اطلاعات پہنچانا تھا۔ اس میں فوجی اخبارات اور رسائل وغیرہ کی اشاعت اور ریڈیو پر فوجی پروگرام نشر کرنا ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ہی برٹش انڈین آرمی کی ہائی کمان کو سیاسی مشورہ دینا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ جب فیض صاحب اپنی ملازمت کے ابتدائی مرحلے پر محکمے کے انچارج آئیرش بریگیڈیئر جیہو کے سامنے پیش ہوئے تو وہ فیض صاحب کی فوج میں شمولیت پر خوش نہ تھا۔ کرنل بیئرڈ نے فیض صاحب کو اندر کی بات بتا دی کہ انہیں خفیہ فائل میں ایک ایڈوانس کمیونسٹ لکھا گیا ہے۔ تو اس کے جواب میں فیض صاحب نے پوچھ لیا کہ کیا کوئی کمیونسٹ معذور بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صلاح الدین لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ترقی پسندوں کی سرگرمیوں کے بارے میں برطانوی حکومت کے پاس پوری معلومات تھیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ بریگیڈیئر نے فیض صاحب سے Quit India تحریک کے بارے میں پوچھا کہ اس سلسلے میں کیا اقدامات کیے جائیں تو فیض صاحب نے کہا آپ کوئی لائن اختیار نہ کریں کیونکہ آپ اپنے ملک کا دفاع کر رہے ہیں اور فیض صاحب نے انہیں مزید بتایا جرمن اور جاپانیوں کے خلاف مزاحمت پر زور دینا چاہیئے۔ چونکہ فیض صاحب نے فوج کے ہر یونٹ میں ایک سیل بنانے کا مشورہ دیا جو یہ تعلیم دے فاشزم کیا ہے۔ یہ تجویز وائسرائے اور کمانڈر انچیف تک پہنچی اور پھر "جوش گروپ " کے نام سے فوج میں تعلیمی کام شروع ہوا اور فیض صاحب کو ''برٹش آف دا امپائر بھی

ملا''

فرنگی فوج میں فیض احمد فیض کی خدمات:

فیض صاحب نے برطانوی فوج میں بہت سی خدمات سرانجام دیں سب سے پہلے تو انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران برطانوی حکمرانوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ سپاہیوں کو رجمنٹ کا جھنڈا اونچا رکھنے اور سرکاری نمک حلال بننے کی بجائے فاشزم کی تعلیم دیں۔ اپنے وطن کو اس تباہی سے بچانا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلائی تو ادھر مسلم لیگ قائداعظم کی قیادت میں پاکستان (۱۹۴۰ء) کا مطالبہ کر چکی تھی۔ اس کی تائید میں احمد سلیم لکھتے ہیں ۱۹۴۰ء میں قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے لاہور کے منٹو پارک میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک کی قرارداد پیش کی۔ بقول احمد سلیم:

> ''۱۹۴۲ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے حق خودارادیت کی بنیاد پر مسلمانوں کے علیحدہ وطن کی حمایت کی جو قیام پاکستان تک جاری رہی۔ اس جنگ کے دوران اور خاتمے کے بعد کمیونسٹ پارٹی اور مسلم لیگ شانہ بشانہ نظر آنے لگیں۔''[۲۳]

فیض صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ کانگریس کا ایک دھڑا عالمی فاشزم کو سپورٹ کر رہا تھا۔ اس کو گاندھی جی کی آشیرواد حاصل تھی جبکہ دوسرا دھڑا کانگریس میں ترقی پسند نظریات رکھنے والے لوگوں کا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے فیض صاحب نے بتایا انہیں انگریز اور دیسی افسروں کو ہندوستان اور کانگریس کے بارے میں لیکچر دینے کا حکم دیا چنانچہ اس وسیلے سے انہوں نے پاکستان کے مطالبے کی ترجمانی کی اور بتایا کہ مسلم لیگ برصغیر کے مسلمانوں کی ترجمان

ہے،اس پر ایک بریگیڈیئر نے اٹھ کر سوال کیا کہ مسلم لیگ کا پاکستان کے بارے میں کیا رویہ ہے۔؟ فیض صاحب کی ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر کی نمائندہ جماعت کن تضادات میں گھری ہوئی تھی۔ جنگ کے خاتمے پر جب جاپانی اور آئی این اے کے قیدی آئے تو فیض کے محکمے سے ان کے بارے میں رائے پوچھی گئی چونکہ اس زمانے میں نیوی میں بھی بغاوت شروع ہو چکی تھی۔ انگریزوں کی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں کا کورٹ مارشل کیا جائے اور انگریزوں کے خلاف غیر سیاسی لوگوں کو بھی سزائیں دی جائیں۔ بقول ڈاکٹر ایوب مرزا:

''ان مسائل سے نپٹنے کے لیے ایک نیا محکمہ انٹر سروسز مورل ڈائریکٹوریٹ بنایا گیا۔ جس میں کمانڈر انچیف کی براہ راست ماتحتی میں کرنل حق نواز اور فیض نے کام کیا'' ۲۴

لیکن ذاتی طور پر فیض صاحب ان لیڈروں کو نظر انداز کرنے کے حق میں تھے۔ جو ایک طرف فاشزم کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے اور دوسری طرف انڈین نیشنل آرمی کے لوگوں کے لیے جلوس بھی نکالتے تھے۔

فاشزم اور فیض احمد فیض:

فاشزم کا ایشیا میں زور:

فیض صاحب نے کانگریس میں فاشزم کے پھیلاؤ کے بارے ڈاکٹر ایوب مرزا کو بتایا کہ ۱۹۳۱ء میں جرمن فاشزم ہندوستان میں اپنے قدم جما چکا تھا اور باقاعدہ فاشسٹ تنظیمیں بھی بن گئی تھیں۔ پھر ۱۹۳۶ء میں جاپانی فاشزم نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے بہت پیسہ بانٹا اور لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ ہندوستان بھی فاشزم کی شدید گرفت میں تھا۔ اس زمانے میں فری آمد و رفت اور تجارت عام تھی۔ جاپانیوں نے اپنا مال بھیج کر ہندوستانی سیلاب برپا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ جاپان نے چین کے بے شمار علاقوں پر زبردستی قبضہ کیا ہوا تھا۔ چین میں تمام قومی طاقتیں مل کر جاپانیوں کے خلاف

جنگ کے لیے متحد ہوئیں۔ اینٹی فاشزم جنگ میں کمیونسٹ بھی آگے آگے تھے۔ چیانگ کائی شیک بھی کمیونسٹوں کے ساتھ شامل تھا لیکن بعد میں اس نے بغاوت کرتے ہوئے متحدہ محاذ توڑ دیا تھا۔ انڈونیشا میں سوئیکارنو تحریک آزادی کے قائدین میں سے تھے۔ جبکہ انڈونیشا ولندیزوں کی غلامی میں تھا۔ سوئیکارنو نے فیصلہ کیا کہ جاپانیوں کے ساتھ مل کر جنگ میں اتحادیوں کے خلاف لڑا جائے چونکہ برما میں بھی فاشزم کو شکست ہوئی۔ مزید فیض صاحب بتاتے ہیں کہ لوگوں کا خیال تھا ایک طرف جاپانیوں سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف آزادی مل سکتی ہے۔ جبکہ فاشزم اور ملکی آزادی دو متضاد چیزیں ہیں۔

اس کی تائید میں پروفیسر فتح محمد لکھتے ہیں انجمن ترقی پسند مصنفین میں اس سوال پر بحث ہوئی کہ فیض احمد فیض نے برطانوی فوج کی ملازمت کیوں اختیار کی تھی؟ احمد ندیم قاسمی نے "معاصر" مارچ ۲۰۰۱ء میں اپنے ایک مضمون میں فیض صاحب کو اس بات پر قصوروار ٹھہرایا کہ انہوں نے سامراج کے ہوتے ہی برطانوی حکومت کی نوکری قبول کر لی تھی۔ جبکہ عبداللہ ملک نے فیض صاحب کو اس الزام سے چھٹکارا دلاتے ہوئے ''فیض اور برطانوی فوج'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔

''بھئی اس میں الجھن کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے فوج اس لیے جائن (join)
کی تھی کہ فاشزم کے خلاف سرگرم عمل ہوں۔''[۲۵]

یوں احمد ندیم قاسمی صاحب کو اپنے سوال کا جواب بھی مل گیا۔ پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں کہ میں بھی سوچتا ہوں کہ فیض صاحب نے برطانوی فوج کی ملازمت کیوں اختیار کی تھی اور انہوں نے برطانوی فوج کا اعلیٰ عہدہ کیوں چھوڑا تھا۔ اس سلسلے میں فیض صاحب نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو بتایا جب جنگ ختم ہونے کو آئی اور آزادی کی منزل قریب نظر آنے لگی تو ایک طرف برطانوی حکومت نے ہندوستان کے آئینی مستقبل کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے تو دوسری طرف پاکستان

اور مسلم لیگ کی تحریک اپنے عروج کو پہنچی۔ میں ان دنوں راولپنڈی میں تھا جو نادرن کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس علاقے کے فوجی تعلقات عامہ کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کی خفیہ کانفرنسوں میں فیض صاحب اور ان کے کچھ سینئر ہندوستانی افسروں کو بھی شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس سے دو تین باتیں واضح ہوئیں۔

"اول: اس جنگ کے بعد انگریز اور امریکن اب ''شمالی خطرے'' یا سوویت روس سے جنگ کی پیش بندیاں کر رہے تھے۔

دوم: انہیں ایک آزاد اور خود مختار پاکستان کا وجود میں آنا گوارا نہیں

سوم: اگر ہندوستان کو آزادی مل بھی جائے یا ہندوستان تقسیم بھی ہو جائے تو فوج کسی صورت بھی تقسیم نہیں ہوگی اور اس کی کمان انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گی"۔ ۲۶

مزید فیض صاحب نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو میں بتایا کہ جب وائسرائے لارڈ ویول ۱۹۴۶ء کے مارچ یا اپریل میں پنڈی اپنا فوجی دربار کرنے آئے شمالی خطرے کو مفروضہ بنا کر سامراجی ہندوستان کو روس کے خلاف استعمال کرنے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے روس کی سوشلسٹ ریاست کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے تھے۔ لہٰذا ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ فیض صاحب اس صورت حال سے پریشان ہو گئے تھے کیونکہ کل تک انگریز اور امریکہ روس کے ساتھ ہٹلر، ٹوجو اور مسولینی کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے اور آج یہ روس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ فیض صاحب نے ارادہ کر لیا کہ ان کی جنگ ایک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ اب ان کی جنگ ہندوستان کی مکمل آزادی اور پاکستان کے قیام کے لیے تھی اور پھر سوشلسٹ روس کے خلاف سازشوں کو بے نقاب کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ مزید لکھتے ہیں کہ ہمارے لیے جدوجہد کا مفہوم تو نہیں بدلا مگر میدان عمل اور ہماری منزل بدل چکی تھی۔ ہم اپنے ملک ، اپنے اصولوں اور بین الاقوامی سوشلزم سے غداری نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض سے پوچھا پھر فیض صاحب

گھڑی کی سوئی گھماتے ہوئے بولے:

''پھر فوج سے کوچ کا وقت آ گیا۔''[۲۷]

اس بات کی تائید پروفیسر فتح محمد ملک بھی کرتے ہیں کہ فیض صاحب کے اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے برطانوی ہند میں فوج کے اعلیٰ عہدہ کو چھوڑنے کا فیصلہ نظریاتی بنیادوں پر کیا تھا اور جب ان پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ انگریز حکومت پاکستان کے قیام کی مخالفت کر رہی ہے اور وہ قیام پاکستان کو روکنے کے لیے بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ تو انہوں نے فوجی عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' کی ادارت قبول کر لی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میاں افتخار الدین نے قائداعظم کے کہنے پر قیام پاکستان سے پہلے ہی ''پاکستان ٹائمز'' جاری کرنے میں مصروف تھے۔ فیض صاحب نے اپنے قومی مسلک اور اپنے بین الاقوامی اشتراکی نصب العین کی خاطر فوجی کرنل کی زندگی کی آسائشوں کو ایک طرف پھینک دیا اور ایک صحافی کی مشقت اور غریبانہ زندگی کو ترجیح دی کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب جاپانی فاشزم نے پورے ایشیا کو اپنی گرفت میں لینے کا ارادہ کر لیا تھا اور جرمن فاشزم نے یورپ پر قبضہ کرنے کے بعد اشتراکی روس پر قبضہ کرنے کے لیے منصوبہ بنا لیا تھا۔ ہٹلر نے سوویت یونین پر حملے کی ابتدا کی ہندوستانی دانشوروں نے فاشزم کے خلاف سرمایہ داری کی جنگ کو ''یہ جنگ ہے جنگ آزادی'' کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے ان میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔ پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں کہ فوجی ملازمت کے دوران فیض صاحب کا نقطۂ نظر اور طرز عمل نظریاتی تھا نہ کہ مفاداتی تھا اس دوران فیض صاحب کی کہی گئی نظمیں بھی اس بات کا ثبوت ہیں۔

''تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے''

''پھر نور سحر دست و گریباں ہے سحر سے''

''میرے ہمدم میرے دوست''

اور

''سیاسی لیڈر کے نام''

میں فیض صاحب کا مسلک آئینے کی طرح صاف شفاف ہے۔فیض صاحب نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو اپنے انٹرویو کے دوران بتایا نظم ''سیاسی لیڈر کے نام'' میں سیاسی لیڈر سے مراد مہاتما اندھی ہیں۔اگر ہم اس نظم کو مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "India Wins Freedom" کے چھٹے باب بعنوان "Uneasy Interval" میں بیان کیے گئے تاریخی حقائق کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں تو اس دور میں فیض صاحب کے انقلابی، سیاسی اور نظریاتی مسلک کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔کیونکہ یہ نظم ایک ایسے زمانے میں وجود میں آئی جب ہٹلر نے پورے یورپ پر تسلط پانے کی غرض کی خاطر روس پر حملہ کر دیا اور جنوبی ایشیاء پر فاشزم کے سائے بڑھنے لگے۔کل ہند کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد یہ جان کر حیران ہوئے کہ گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس کی مجلس عاملہ کھل کر فاشزم کی جنگ میں لڑ رہی تھی جبکہ فاشزم کی مخالفت میں مولانا عبدابوالکلام آزاد اکیلے کھڑے تھے۔جواہر لعل نہرو ایک حد تک مولانا کے نقطہ نظر سے متفق تو تھے مگر گاندھی جی کے ڈر کی وجہ سے مولانا کی حمایت میں بولنے سے ڈرتے تھے اور مولانا بھی داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے گاندھی جی کی فاشزم دوستی کے خلاف آواز اٹھائی۔کل ہند کانگریس کمیٹی کے الہٰ آباد کے اجلاس ۲۹ اپریل تا ۲ مئی ۱۹۴۲ء کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اپنی کتاب "India wins Freedom" میں لکھا ہے:

> ''میں نے ان لوگوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے کو اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ جاپان ہندوستان کو انگریزوں سے چھین کر آزاد کر دے گا۔قومی مفاد کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے موجودہ غیر ملکی آقاؤں کو نئے غیر ملکی آقاؤں سے بدلنے کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔برطانیہ سے اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود

برصغیر پر جاپان کی ممکنہ جارحیت کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور جاپانی فاشزم کا براہ

راست یا بالواسطہ خیر مقدم ہرگز نہ کریں''[۴۸]

گاندھی کو اس طرز استدلال سے سخت اختلاف تھا کیونکہ ان کے زیر سایہ کانگریس کے بڑے رہنما فاشزم کی حمایت میں آگے آگے تھے۔ مولانا خود گاندھی جی کی خدمت میں پیش ہوئے انہیں اپنا ساتھی بنانے کی کوشش کی لیکن اس کا پھر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مولانا آزاد نے اپنے اندیشوں کو کل ہند کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں چند سوالات پیش کیے مگر یہ جان کر حیران رہ گئے کہ اراکین اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں گاندھی جی کی عقل و دانش پر مکمل اعتماد کرنا چاہیئے۔ اگر ہم گاندھی جی کی قیادت پر انحصار کر لیں تو وہ آگے آنے والی مشکلات کا کوئی حل ضرور نکال لیں گے لیکن گاندھی جی کو میرے نقطہ نظر سے شدید اختلاف تھا اور پھر مہاتما گاندھی نے مجھے پیغام بجھوایا کہ اگر کانگریس یہ چاہتی ہے کہ میں تحریک آزادی کی قیادت کروں تو آپ نہ صرف کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہوں بلکہ مجلس عاملہ کی رکنیت سے بھی دست بردار ہو جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مہاتما گاندھی کے فاشسٹ خیالات اور آمرانہ رویے پر جس طرح مہذب طریقے سے طنز کیا ہے۔ وہ فیض صاحب کی نظم ''سیاسی لیڈر کے نام'' دلکش اور حسین انداز میں اس بات کی عکاسی کرتی ہے۔

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ

رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے

فاشزم کی جنگ جس کے خلاف مولانا آزاد ہو گئے تھے۔ یہ ڈیڑھ صدی کا قصہ ہے۔ عوام کی استقامت اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن اس انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں رات کی تاریکی ختم ہو رہی ہے اور صبح کی دھڑکن کی صدا آ رہی ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی طلوع آزادی کی راہ ہموار کرنے کی بجائے ''آقاؤں کی تبدیلی'' کا سیاسی مسلک اپنا رہا ہے۔ برطانوی سامراج کی جگہ جاپانی سامراج کو ہندوستان میں راج کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔ فیض

صاحب نے نظم میں مہاتما گاندھی کو مخاطب کر کے اہم سوال اٹھائے تھے، نصف صدی بعد منظر عام پر آنے والے انکشافات کے مطابق یہ سوال مولانا ابوالکلام آزاد نے آل انڈیا کانگریس کے سامنے پیش کیا تھا۔ مولانا صاحب ورکنگ کمیٹی کے سامنے بھی مایوس ہوئے۔ جبکہ مہاتما گاندھی نے بھی انہیں مایوس کر دیا اور فیض صاحب کی اس نظم کو ہمارے ترقی پسند شعرا اور روشن خیال دانش وروں نے تاریخی تناظر میں کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور احمد ندیم قاسمی بھی فیض صاحب کی فوج میں شمولیت کو نہ سمجھ سکے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فیض صاحب نظریاتی جنگ میں بہادری و دلیری کے جذبے سے برطانوی جنگ میں شامل ہوئے تھے اور ان پر ''چودہ طبق'' روشن ہو ئے تو نظریاتی وجوہات کی بنا پر برطانوی فوج میں اعلیٰ عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

آخر کار فیض نے فوج کو خیر باد کہہ دیا۔ فیض انگریزی فوج میں فاشزم کے خلاف میدان میں اتر چکا تھا اس دوران اسے شعر کہنے کی فرصت نہیں ملی۔ جب ایوب مرزا نے ان سے پوچھا کہ آپ کی شاعری میں فاشزم کے خلاف کوئی غزل یا نظم نہیں۔ بولے یہ درست ہے ہم نے اس زمانے میں بہت کم لکھا ہے لیکن پھر بھی لکھا ہے۔

''تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے''

''نور سحر دست و گریباں ہے سحر سے''

اور

''میرے ہمدم میرے دوست'' اسی دور کا کلام ہے اور سیاسی لیڈر کے نام والی نظم ہم نے گاندھی کے لئے لکھی تھی۔

ڈاکٹر آفتاب احمد اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ سیاسی لیڈر کے نام والی نظم انہوں نے گاندھی جی کو مخاطب کر کے لکھی تھی۔ اس نظم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے آفتاب احمد لکھتے ہیں۔ سیاسی لیڈر کے نام اس قوت لکھی گئی جب گاندھی

جی نے ہندوستان چھوڑو تحریک شروع کرنے کے بعد یہیں اسے روک لیا تھا جب وہ اپنے عروج پر تھی اور جمہوری قوتوں کی تھریک بنتی جارہی تھی۔ یہاں بھی رات کی تاریکی کا پردہ چاک کرنے والوں کے بارے میں کہتے ہیں:

''اب رات کے سنگین وسیہ سینے میں اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے جا بجا نور نے

اک جال سا بن رکھا ہے۔ دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے۔''۲۹

اس کے بعد گاندھی جی خطاب کرتے ہوئے جمہوری قوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے احمد سلیم بھی لکھتے ہیں کہ سیاسی لیڈر کے نام نظم فیض صاحب کی اس دور کی اہم ترین نظم ہے جس میں انہوں نے گاندھی جی سے خطاب کیا تھا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ایک دن چھٹی لے کر فیض بے ارادہ لاہور میں پروفیسر چیٹر جی سے ملے وہ ایک زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ اب ڈائریکٹر ایجوکیشن تھے۔ فیض نے کہا اب جنگ ختم ہو چکی ہے ہم واپس آنا چاہتے ہیں چیٹر جی بہت حیران ہوئے۔ بولے فوج سے باہر آ کر تم کیا کرو گے۔ عیش تم نے کی، بنگلہ اردلی گاڑی تمہارے پاس باہر آ کر یہ سب کچھ نہیں ملے گا اور جب چیٹر جی کو معلوم ہوا کہ فیض کو ڈھائی ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی ہے بولے اتنی تنخواہ تمہیں فوج سے باہر کہاں ملے گی۔ نہیں مل سکتی یہ محکمہ تعلیم ہے فوج نہیں۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ فوج سے واپس تعلیم میں مت آؤ۔ مگر فیض نے انہیں فیصلہ سنا دیا کہ اب وہ فوج میں نہیں رہیں گے اور ان سے کہا:

''صرف پانچ سو روپیہ ماہانہ مل جائیں تو تقدیر سنور جائے گی چیٹر جی نے سکتے کے

عالم میں عجب انداز سے فیض کو گھورا اگر تم نے یہی ٹھان لی ہے اور تمہارا مقدر چکر

میں ہے تو پھر آ جاؤ۔ لیکچرار کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ تین سو پچاس روپے ماہانہ

ہے۔ یہ میری طرف سے حاضر ہے۔ جب چاہے لے لو۔''۳۰

اس کی تصدیق میں احمد سلیم لکھتے ہیں کہ جنگ کے خاتمے پر فیض صاحب نے فوج کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا انہوں

نے واپس تدریس کے شعبے میں جانے کا فیصلہ کرلیا۔وہ گورنمنٹ کالج کے سابق پروفیسر چیٹر جی جواب محکمہ تعلیم کے ڈائیریکٹر بن چکے تھےان کے پاس گئے۔

''ہم نے کہا کہ جنگ ختم ہوگئی ہےاوراب ہم واپس آنا چاہتے ہیں اب ہماری استادی لوٹادو چیٹر جی بہت حیران ہوئے کہنے لگے بھائی فیض!فوج سے باہرآ کر کیا کروگے؟تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟۔وہ ہزار پانچ سوروپے چیٹر جی اٹھ کھڑے ہوئے۔کہنے لگے بھائی،اتنی تنخواہ تمہیں فوج سے باہر کہاں ملے گی؟ مجھے نہیں ملتی مل سکتی ہی نہیں۔۔۔۔۔ہم نے چیٹر جی کو سمجھایا کہ ہمیں ڈھائی سوروپے ماہانہ مل جائیں تو تقدیر سنور جائے۔چیٹر جی عجیب انداز سے منہ دیکھ رہے تھے کافی لمبے سکتے کے بعد فرمانے لگے بھائی،اگرتم نے یہی ٹھان لی ہےاورتمہارا مقدر چکر میں ہےتو پھرآجاؤلیکچرر کی Highest Pay ساڑھے تین سوروپے ہے۔''[۳۰]

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ فیض صاحب دوسری جنگ عظیم کے خاتمے اور پھر ہندوستان کے سیاسی حالات کی وجہ سےفوج کی ملازمت سے فارغ ہونا چاہتے تھے یہ بھی درست ہے کہ فیض صاحب کے لئے پاکستان ٹائمز کی ادارت ایک اچانک خبر کےطور پر سامنے آئی۔جس کے لئے وہ خود ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔فیض صاحب نے ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔بقول ایوب مرزا:

''اسی دوران میں میاں افتخارالدین فیض صاحب کے پاس آئے اور کہالو بھائی وہ دیکھو۔ہم پاکستان ٹائمز لاہور سے نکال رہے ہیں میں نے تمہارانام چیف ایڈیٹر کے لئے تجویز کیا ہے جواب میں فیض نے کہا میاں صاحب آپ کمال کر

رہے ہیں۔ میں نے صحافت میں کبھی قدم نہیں رکھا اتنا برا پرچہ میں کیسے چلا سکتا

ہوں نا بابا مجھے معاف کریں۔ میاں صاحب ناراض ہوئے۔ میں کوئی بے وقوف

ہوں تم نے مجھے جاہل سمجھا ہے جو تمہارا نام تجویز کر آیا ہوں۔ اور اگر نا تجربہ کاری

دلیل ہے تو فوج کا تجربہ تمہیں کہاں تھا؟۔ بس اب فوج سے ریلیز کی درخواست بھیج

دو۔ دو ماہ میں پرچہ سڑکوں پر ہونا چاہئے۔''[۳۱]

فیض نے فوج سے علیحدگی کی درخواست بھیج دی اور وہ منظور ہوگئی میاں صاحب نے پلٹ کر فیض سے کوئی رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی فیض صاحب نے میاں صاحب سے پوچھا کہ آپ کا پرچہ کہاں گیا ادھر فیض سردار پٹیل کے انٹرویو میں نہیں گئے۔ جس سے فیض صاحب کے دوست عظیم حسین خفا ہو گئے کہ پٹیل خوہ مخواہ میں فیض صاحب کا انتظار کرتے رہے۔ اسی کشمکش میں فیض صاحب نے فوج میں چھ ماہ کی توسیع کروالی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ایک دن میاں صاحب فیض صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ لاہور چلو اور پرچہ نکالو تو فیض صاحب نے کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میاں صاحب نے کہا کہ میں نے عارضی بندوبست کرلیا ہے اور ایک انگریز ملازم رکھ لیا ہے جو تمہیں اخبار کے متعلق فنی باتیں سمجھائے گا بس پھر خود اخبار چلا لینا یہاں تمہیں ڈھائی ہزار ملتے ہیں۔ میں تمہیں صرف ایک ہزار ماہانہ دوں گا اور تمہیں رہنے کے لئے مکان کی بھی ضرورت پڑے گی اور باغبانپورہ میں ہماری ایک حویلی ہے تم بچوں کو لے کر وہاں آجانا بندوبست ہوگیا اور فیض فوج چھوڑ کر ایک نئی منزل کی طرف چل پڑا۔ بیوی بچوں کو دلی چھوڑ کر فیض لاہور پہنچ گیا۔ ایوب مرزا نے فیض کا فوج چھوڑنے کی کوئی تاریخ یا سن نہیں بتایا۔ اشفاق حسین کے مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو فیض نے فوج سے علیحدگی اختیار کرلی ماہرہ خانم سے ایک ملاقات کے دوران ایلس فیض نے بتایا

''فیض جون ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۴۶ء تک فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے وابستہ

رہے۔''۳۲؎

ڈاکٹر آفتاب احمد کے مطابق جنوری ۱۹۴۷ء ہے لیکن میری رائے کے مطابق صلاح الدین حیدر اور اشفاق حسین کی معلومات زیادہ بہتر اور مستند ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین حیدر نے ماہرہ خانم کا تحقیقی مقالے کا حوالہ دیا ہے جس میں ایلس نے خود بتایا ہے کہ فیض جون ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۴۶ء تک فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں:

''۴ فروری ۱۹۴۷ء کو فیض کی چیف ایڈیٹری کے تحت پاکستان ٹائمز پر نمودار ہو

چکا تھا پاکستان ٹائمز کا پہلا پرچہ سڑکوں پر تھا۔''۳۳؎

اس کی تصدیق میں اشفاق حسین لکھتے ہیں کہ ۴ فروری ۱۹۴۷ء کو لاہور کی سڑکوں پر پاکستان ٹائمز کا شمارہ موجود تھا۔ میری رائے میں ڈاکٹر ایوب مرزا کی معلومات مستند ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ ایڈیٹرز اور فیض احمد فیض:

فیض صاحب نے پاکستان ٹائمز شروع کرتے ہی صحافتی محاذ پر ٹریڈ یونین کے کام کی ابتداء کر دی تھی سب سے پہلے ایک ایڈیٹر کمیٹی بنائی گئی انہی کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ ایڈیٹرز کانفرنس کا انعقاد ہوا اس کانفرنس کو قائداعظم محمد علی جناح نے خطاب کیا تھا فیض احمد فیض اور حمید نظامی نے ایک ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اور ان کی آپس میں بہت ہم آہنگی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد فیض کی کاوشوں سے ایک پریس ایڈوائزری کمیٹی بھی تشکیل دی گئی فیض اس کے کنوینر تھے۔ ان کے علاوہ مزید پانچ ممبران حمید نظامی، شورش کاشمیری، نور الٰہی، مولوی اختر علی خان اور بٹسن تھے اس وقت پریس

برانچ کے بڑے لیڈر چوہدری محمد حسین تھے ان کی اور فیض کی پریس ایڈوائزری کمیٹی کے مابین مسلسل چلتی رہتی تھی۔ خاص کوشش کے بعد اس کمیٹی نے پنجاب گورنمنٹ سے منوالیا تھا اس کمیٹی کے مشورہ کے بغیر کسی اخبار کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی۔

کچھ عرصہ بعد پنجاب حکومت نے پریس پر پابندی لگا دی کہ فسادات کے متعلق کسی اخبار میں کوئی خبر نہ لگائی جائے اس مسئلے پر فیض اور کمیٹی کے ممبران کی سرکار سے کمٹمنٹ ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں پاکستان ایڈیٹر کانفرنس قائم ہوئی اس کے صدر الطاف حسین تھے اور نائب صدر بٹسن (غیر مسلم) اور دوسرے نائب صدر پیر علی محمد راشدی تھے۔ ان کے مقابلے میں دوسری طرف فیض اور حمید نظامی ڈٹ گئے تھے۔ فیض اس زمانے میں اپوزیشن میں تھے۔ بقول فیض:

''بھئی اس کے بعد جتنی بھی لڑائیاں ہوتی رہیں وہ ہم نے مل کر لڑیں۔''[۳۴]

ایسے لگتا ہے شروع سے ہی ان کا معاملہ صاف تھا۔ اس ملک میں جمہوریت اور جمہوری اقدار کے لئے فیض احمد فیض اور حمید نظامی نے نے مل کر انتہائی نازک حالات میں صحافتی محاذ پر آواز اٹھائی حکومت غیر جمہوری اقدام پر انگلی اٹھانے والے کو غدار وطن قرار دے کر اس کی گردن اڑانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی لیکن فیض صاحب اور حمید نظامی جمہوریت اور اس کی بقا اور ملک کی سلامتی کی خاطر اس محاذ پر ڈٹے رہے۔ فیض پکار اٹھے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

اس نظم پر خاصا شور مچا اور بائیں اور دائیں بازو کے دھڑوں کی طرف سے فیض کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس موقع

پرڈاکٹرایوب مرزا لکھتے ہیں کہ اندھیرے کے پجاریوں اورابن الوقت بددیانت سیاسی لٹیروں اوران کے گماشتوں نے فیض کے خلاف پروپیگنڈے کی بھرمار کردی کہ اس نظم سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے پاکستان کی تخلیق کوسرے سے قبول ہی نہیں کیا۔نظم میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں تھا، لٹے پٹے لوگ، لاوارث بھٹکے ہوئے مہاجرعوام اوردانش ورحیران تھے کہ یہ کیا ہوگیا۔انہوں نے پاکستان کے قیام کے لئے جان کی بازی لگادی تھی۔وہ پاکستان کی بقا کے لئے متحد ہونا شروع ہوگئے۔

فیض صاحب کہتے ہیں کہ آزادی محض ایک سراب ثابت ہوئی اوراس سے حاصل ہونے والی خوشی بہت عارضی تھی وہ لوگ جوآزاد پاکستان میں سیاسی اورسماجی انصاف کا خواب دیکھا کرتے تھے اوراپنی تحریروں میں انہی رجحانات کا اظہاربھی کرتے تھےاورقدرتی طورپراکثریت کومتاثر کرتے تھے۔آزادی کے بعدوہ سب باطل ثابت ہوااورجھوٹ نکلا۔

اس نظم اورآزادی کی جدوجہد کے بارے میں اشفاق حسین لکھتے ہیں کہ زمانہ جذباتی ہیجان کا زمانہ تھا۔ خصوصاً پنجاب میں تقسیم کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں لوگوں کوجس طرح مشکلات کا سامنا کرنا پڑااورجس طرح عورتوں کی عصمتیں پامال کی گئیں اورجس طرح گھراجڑے اس المیے کے متعلق سب ادیبوں اورشاعروں نے لکھا۔مگران سب کی نظریں انسانیت کی بلکتی اورتڑپتی انسانیت کے زخمیوں تک گئیں ان کے یہاں اس کا رونا تو تھا مگرکوئی علاج نہیں تھا وقتی مرہم پٹی تھا۔لیکن فیض صاحب کی نگاہیں مستقبل پرتھیں اس لئے وہ کہہ رہے تھے۔

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ان کوصاف نظرآرہا تھا کہ اگراسی طرح لوگوں کے جذبات کے ساتھ کھیلا گیااوران کے اصل مسائل کی طرف توجہ نہ دی گئی تو کہیں ان کی قربانیاں رائیگاں نہ ہوجائیں۔انہوں نے اس نظم میں آزادی کوصرف پہلے مرحلے کےطور پرقبول کیااوراس کی اگلی منزلوں کی طرف بڑھنے کی ہدایت بھی کی ہےاوراس میں بھی زخموں پرمرہم رکھا گیا ہے۔اس نظم پرتنقید

کرنے کی بجائے اسے تو آزادی کا نعرہ بنالینا چاہیے تھا تا کہ آزادی کی اصل نعمتوں سے فیض یاب ہو سکتے مگر ایسا نہ ہوا اور اس کے نتیجے میں جو صورت حال پیدا ہوئی وہ کچھ اتنی خوش کن بھی نہیں تھی۔اس نظم پر اعتراض کرنے والوں میں علی سردار جعفری بھی تھے انہوں نے یہاں تک کہہ دیا:

''یہی بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں، کیونکہ انہوں نے پاکستان کے لئے چھ صوبوں کا مطالبہ کیا تھا۔لیکن انہیں ملے مغربی پاکستان میں ساڑھے تین صوبے اور مشرقی پاکستان میں پون صوبہ۔اسی طرح جن سنگی بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیوں کہ اکھنڈ بھارت نہیں ملا جسے وہ بھارت ورش یا آریا ورش بنانے والے تھے۔''۳۵

یہ وہ سحر تو نہیں ہے جسے آزادی کی سحر کہا جا سکے۔مگر ایک بات تو ضرور کہا جا سکتی ہے کہ اس نظم میں ایسی سچائی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان خاص طور پر پاکستان کے سیاسی پس منظر میں یہ نظم کبھی بے تعلق نہیں ہوئی کسی نہ کسی حوالے سے ،کہیں نہ کہیں اس کا ذکر ضرور آیا ہے۔ڈاکٹر آفتاب لکھتے ہیں:

''صبح آزادی اس دور کی نظموں میں ہی نہیں شاید فیض کے پورے کلام میں سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔اور سب سے زیادہ زیر بحث رہی ہے اس نظم میں پہلی دفعہ فیض کے ہاں ایک مایوس پکار سنی جا سکتی ہے۔بات یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر برصغیر کی آزادی تو بہر حال متوقع تھی مگر ہمارے ہاں کے ترقی پسند حلقوں نے اس کے ساتھ جمہوری انقلاب کی بھی امید لگا رکھی تھی۔فیض کی اب تک کی شاعری میں جو "صبح ہونے کو ہے۔اے دل بے تاب ٹھہر " کی لے بار بار

ابھرتی تھی اس کی بنیاد بھی یہی امید تھی ،مگر ہوا یہ کہ آزادی تو آئی اور انقلاب نہیں آیا

بلکہ آزادی اپنے ساتھ ایک ہنگامہ نشور لائی ،کشت وخون اور شکست وریخت کا وہ

بازار گرم ہوا کہ انسان اپنی انسانیت بھول گیا۔''۳۶

جو انسان اپنی انسانیت بھول گیا ہے اس کا غم بھی اسی نظم میں نظر آتا ہے جس کو فیض صاحب نے بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ میری رائے کے مطابق یہ زمانہ جذباتی ہیجان کا زمانہ تھا ہزاروں لاکھوں کو جس طرح مصائب کا سامنا تھا کسی نے ان کے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا جس طرح لوگوں کے جذبات سے کھیلا گیا اور ان کے مسائل کو نظر انداز کیا گیا۔ اس لئے فیض صاحب کہہ رہے تھے

نجات دیدہ دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

آزادی ایک سراب ثابت ہوئی اور اس سے حاصل ہونے والی خوشی بہت عارضی تھی۔

ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں دلچسپی:

فیض صاحب جب سیاست کی دنیا میں آئے تو انہوں نے ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں دل چسپی لینا شروع کر دی تھی اور اس کا تانا بانا امرتسر کے قیام کے دنوں سے جڑتا ہے۔ فیض صاحب نے لاہور میں اس کی ابتدا صحافیوں کی انجمن سے کی بعد میں وہ صنعتی مزدوروں کی یونینیوں میں بھی شامل ہو گئے تھے پھر پاکستان بننے کے بعد وہ لاہور ریلوے یونین کے نائب صدر ہونے کے ساتھ ساتھ پوسٹل یونین کے صدر بھی چنے گئے چونکہ فیض صاحب صحافتی ذمہ داریوں میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ اس سرگرمیوں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۹ء میں

آئی -ایل-او فرانسسکو میٹنگ میں فیض صاحب نے پاکستان کی مزدور برادری کی نمائندگی کی تھی چونکہ اس وقت تک قومی سطح پر سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر مزدور تنظیم نہیں تھی۔فیض صاحب نے پاکستان میں مزدوروں کو متحد اور منظم کرنے کے لیے اپنی کوششوں سے پہلی مرتبہ "پاکستان فیڈریشن آف لیبر" کے قیام کو ممکن بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اگر مزدور تحریک کی بات کی جائے تو اس سلسلے میں فیض صاحب کا نام سرفہرست آتا ہے۔فیض احمد فیض ایک نامور شاعر، صحافی، ادیب اور روشن خیال دانشور تھے۔وہ ملک کے محنت کشوں، مزدور طبقہ کے ہمدرد اور خیرخواہ بھی تھے۔کیونکہ اس بات کا ثبوت امرتسر میں ان کے قیام طالب علمی سے ملتا ہے بعد میں انہوں نے استاد کے طور پر سیاسی طور پر ہر اس مہم میں حصہ لیا جو انگریز دشمن کے خلاف اور برصغیر کی آزادی کے حق میں ہوتی تھی۔قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پاکستان کے ناخواندہ محنت کشوں کے متعلق آگاہی دینے اور ان کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے بہت کام کیا۔ بقول یوسف بلوچ:

> ''پاکستان میں سب سے پہلے ڈاکخانہ جات کے ملازمین کی انجمن سازی کے لیے انہوں نے ٹریڈ یونین کو منظم کیا اور ملازمین کو تعلیم یافتہ کیا اس کے علاوہ پاکستان کی پہلی ملکی سطح کی قومی مزدوروں کی تنظیم پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر بنائے گئے۔جبکہ مرزا ابراہیم صدر تھے۔انہوں نے ملک بھر میں محنت کشوں کی صحت مند انجمن سازی کے لیے دورے کیے اور اس تنظیم میں محنت کشوں کو متحد و منظم کیا اور ساتھ ہ محنت کشوں کو سٹڈی سرکل کے ذریعہ تعلیم بھی دیتے رہے۔تا کہ اچھے، برے کو پہچان سکیں''۳۷

فیض صاحب اپنے مزدور طبقہ کے ساتھ بہت مہربان تھے۔وہ ریلوے ورکرز کے ساتھ بھی نرمی سے پیش آتے

تھے کیونکہ ریلوے کا طبقہ بہت کم پڑھا لکھا ہوتا تھا اور ان کے دفتری کام کی کاروائی انگریزی زبان میں ہوتی تھی۔ تو فیض صاحب ان کو سارا کام اپنے ہاتھ سے کر دیتے تھے۔ فیض صاحب نے محنت کشوں کے لیے گیت، غزلیں بھی لکھیں۔ اس کی تصدیق میں احمد سلیم لکھتے ہیں:

''۴۹۔۱۹۴۸ء کے دوران انہوں نے پاکستان ٹریڈ یونین کے نمائندے کے طور پر بین الاقوامی مزدور کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ کمیونسٹ پارٹی سے ان کا تعلق قیام امرتسر کے دنوں سے چلا آ رہا تھا مزدور سیاست سے ان کی وابستگی انہیں پارٹی کے اور قریب لے آئی۔''[۳۸]

عالمی امن تحریک:

دوسری عالمی جنگ عظیم میں ایٹم بم کے استعمال سے جو تباہی پھیلی اس کو دیکھتے ہوئے بائیں سوچ بدل گئی اور دنیا میں مستقل امن کے قیام کی ضرورت پر زور دینا شروع کر دیا۔ پوری دنیا کے لاکھوں کروڑوں لوگوں نے عالمی امن کے قیام کے لیے ایک بھرپور مہم چلائی اور اپنے دستخطوں کی مدد سے اقوام متحدہ کے ایوانوں میں اپنی آواز بھی پہنچائی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے بھی ایک صحافی اور رٹریڈ یونین کے ورکر کی حیثیت سے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پاکستان میں اس کی حمایت میں دستخطی مہم چلائی۔ فیض صاحب کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ شامل تھے۔ اس کے علاوہ امن عالم کے قیام کے سلسلے میں پاکستان میں بھی بہت سی کوششیں ہوئیں ان میں فیض صاحب کسی طرح بھی پیچھے نہ رہے۔ وہ عالمی امن کے قیام کو تمام انسانیت کے انتہائی ضروری سمجھتے تھے اور اس کے لیے سرتوڑ کوششیں بھی کیں۔ فیض صاحب کے لیے لینن امن انعام برائے امن، ان کو ان کی اسی خدمت کے پیش نظر دیا گیا کیونکہ انہوں نے عالمی امن کے

قیام کے لیے بہت جدوجہد کی اور وہ اس انعام کے مستحق بھی ٹھہرے تھے۔اس سلسلے میں سبط حسن لکھتے ہیں:

''ہماری نئی نسل کو شائد معلوم نہ ہو کہ ۱۹۴۸ء میں جب سویت یونین کی اپیل پر ہر ملک میں امن کمیٹیاں بننے لگیں تا کہ سامراجی طاقتوں کی جنگی تیاریوں کا سد باب کیا جائے تو فیض صاحب پاکستان کی مرکزی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔آج کل تو وہ حکومتیں بھی امن، امن کہتے نہیں تھکتیں جو دن رات ایٹم بم،ایٹمی میزائل، اور دوسرے ہلاکت آفریں ہتھیار بنانے میں مصروف ہیں مگر اس وقت سامراج نواز ملکوں میں امن کا نام لینا بھی جرم تھا۔''۳۹

لیکن فیض صاحب نے افسر شاہی کے عتاب کی پرواہ نہ کی وہ امن کمیٹی کی سرگرمیوں میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے اور لاہور اور اوکاڑہ، گوجرانوالہ غرض یہ کہ جہاں کہیں امن کمیٹی کا جلسہ ہوتا اس میں تقریر کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ سامراجی طاقتوں کی جنگی تیاریوں سے نہ صرف دنیا کا امن اور نو آزاد ملکوں کی آزادی ہی خطرے میں ہے بلکہ پاکستان جیسے پسماندہ ملک کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے بھی عالمی امن کتنا ضروری ہے اور فیض صاحب ۱۹۵۱ء میں اپنی گرفتاری تک قیام امن کی ہر مہم میں پیش پیش رہے۔میری نظر میں ایوب مرزا نے جو ہمیں معلومات دی ہیں ان سے ہمیں فیض صاحب کی فکر کا پتہ چلتا ہے وہ عالمی امن کے قیام کے لئے کتنے سرگرداں رہے یہاں تک کہ فرنگی فوج کے سامنے ہار نہیں مانی۔امن عالم کے قیام کے لئے انہوں نے روزناموں میں لکھا اور اپنی یونین میں دستخطی مہم بھی چلائی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان:

فیض صاحب ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے بارے میں بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پاکستان میں ترقی پسند

مصنفین کی انجمن تحریک کی صورت میں ابھری اس نے اردو ادب میں بے شمار اہم اضافے کیے۔ پھر ختم ہوگئی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں کمیونسٹ پارٹی کے کلکتہ کانفرنس میں اہم فیصلے ہونے تھے۔ وہاں پر کمیونسٹ آف انڈیا سے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان وجود میں آئی۔ سجاد ظہیر اس نئی وجود میں آنے والی پارٹی کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ وہ ابھی پاکستان نہیں آئے تھے۔ اسی دوران کلکتہ کی ہدایت پر سجاد ظہیر اور مرزا اشفاق علی بیگ پاکستان پہنچے انہیں یہاں کے حلقوں نے حملہ آور تصور کیا جبکہ سجاد ظہیر ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے بانیوں میں سے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کی وجہ سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں سجاد ظہیر ملک سے غائب تھے جبکہ فیض صاحب اس وقت پاکستان ٹائمز اور امروز کے مدیر اعلیٰ تھے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ انہی دنوں ترقی پسند مصنفین پر حملہ ہوا۔ لاہور کے وائی ایم سی اے ہال میں یوم مئی منانے کے لیے ایک بڑا جلسہ ہوا ترقی پسند مصنفین کی انجمن سب سے آگے تھی اور جلسے میں ادیبوں، دانش وروں کے علاوہ مزدور کارکن اور ٹریڈ یونین والوں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس جلسے کی صدارت کے فرائض فیض صاحب نے ادا کیے۔ دوسری طرف اردو اخبار ''احسان'' ترقی پسندوں کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ اس نے حملہ کرتے ہوئے لکھا:

۱ : اسلام کی توہین ہوئی ہے۔

۲ : لینن کو قائداعظم سے بڑا بنایا گیا ہے۔

۳ : مرتدوں کا جمگھٹا پیدا ہوگیا ہے۔

کیونکہ جلسے میں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر عوام دشمن طاقتیں گھبرا گئی تھیں اور ترقی پسندوں پر گھٹیا قسم کے الزامات لگانے شروع کر دیے۔ ترقی پسندوں کی جماعت میں تفرقہ پیدا ہوگیا تھا۔ فضل الٰہی قربان کو پارٹی سے نکال دیا گیا فیض صاحب ان دنوں مرزا ابراہیم والی ٹریڈ یونین کے نائب صدر تھے۔ چونکہ ابراہیم صاحب جیل میں تھے اس لئے فیض

صاحب کو ٹریڈ یونین کا صدر بنا دیا گیا تھا۔

۱۹۴۸ء انگریزیوں کے پرانے نمک خوار خطیب مسجد وزیر خاں (لاہور) نے فیض کے خلاف فتویٰ دیا اسی مولانا نے محمد علی جوہر کے خلاف بھی فتویٰ داغ دیا۔ اس کے بعد لاہور کی چالیس مساجد میں مولویوں نے خطبے بھی پڑھے اور لوگوں کو تشدد پر اکسایا اس کے جواب میں بیرون موچی دروازہ (لاہور) ریلوے یونین کا جلسہ ابراہیم صاحب کی صدارت میں ہوا اس جلسہ میں پوسٹل یونین والے بھی شامل تھے فیض صاحب اس یونین کے صدر تھے۔ ترقی پسند مصنفین نے اپنی کانفرنس لاہور کے اوپن ائیر تھیٹر میں منعقد کی لوگوں کا جوش و جذبہ بہت بلند تھا۔ ان دنوں انجمن کے سیکرٹری احمد ندیم قاسمی تھے یہ کانفرنس بہت حد تک کامیاب ہوئی۔ اس کانفرنس میں فیض صاحب نے قوالی "تماشہ ہم بھی دیکھیں گے" پڑھی۔ اس کی تائید میں اشفاق حسین لکھتے ہیں ترقی پسند مصنفین کی یہ کانفرنس لاہور کے اوپن ائیر تھیٹر میں ہوئی اور بہت کامیاب رہی۔ مخالفین نے اس میں ہنگامہ آرائی بھی کی مگر کسی حد تک کامیاب نہ ہو سکے اس کانفرنس میں فیض صاحب نے اپنی قوالی نما نظم سرمقتل سنائی۔

سرمقتل (قوالی):

کہاں ہے منزل راہ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل جمال روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے
ذرا صیقل تو ہوئے تشنگی بادہ گساروں کی

۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر ترقی پسند مصنفین کے مخالف ہو گئے تھے۔ انہوں نے مخالف نظم لکھ احسان میں

چھپوادی اور پھر اس کے جواب میں مولانا چراغ حسن حسرت اپنی نظم نوائے وقت میں چھپوادی۔

پہلی تفریق تو تاثیر صاحب اور حسرت صاحب میں ہوئی یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے خلاف اخباروں کالموں میں لکھتے رہے۔ پھر تاثیر صاحب اور فیض صاحب میں مخالفت پیدا ہوئی یہاں معاملہ بہت نازک تھا۔ فیض صاحب تاثیر صاحب کے چھوٹے ہم زلف بھی تھے۔ تاثیر صاحب نے جب میاں افتخار الدین اور بائیں بازو والی جماعتوں کے خلاف محاذ کھڑا کیا تو صاف ظاہر ہے کہ فیض بھی اس کی زد میں تھے اگر چہ تاثیر صاحب نے اشارتاً بھی ان کا نام کبھی بھی نہیں لیا۔ فیض سیاسی عقائد میں میاں افتخار الدین کے مرید تھے۔ ان کے اخبار ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر وہ تاثیر صاحب کی ان حرکتوں سے دل برداشتہ تو ہوئے مگر انہوں نے کبھی کسی تلخی کا اظہار نہیں کیا یہ ان کی عادت ہی نہیں تھی۔ بہر حال دونوں کے بچے تو آپس میں ملتے رہے مگر فیض صاحب اسی وجہ سے تاثیر صاحب سے علیحدہ ہو گئے۔ تعلقات کی اس ناخوشگوار نوعیت کے دوران ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو اچانک تاثیر صاحب وفات پا گئے۔ اس دوران فیض صاحب لاہور سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کو اطلاع دی گئی اور وہ جنازے میں پہنچ گئے۔

فیض صاحب ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ترقی پسندی کی تحریک کی ابتداء بالکل نئے موضوع سے ہوئی ابھی یہ تحریک پوری طرح پھیلی نہیں تھی کہ اس میں انتہا پسندی آ گئی۔

پاکستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن معرض وجود میں آئی تو اسے بھی وہی انتہا پسندی کا مرض لاحق ہو گیا تھا فیض صاحب نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ انتہا پسند لوگوں نے ادب کے دھارے کو حقیقت پسندی سے کومیڈ سوشلسٹ حقیقت پسندی کی جانب موڑنے کی کوشش کی ایسا ہمارے ملک کے مخصوص سماجی اور سیاسی حالات میں ممکن ہی نہیں تھا ایک غیر سوشلسٹ ریاست کی حدود میں اس نوعیت کے ادب کو آسانی سے تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر غربت، افلاس اور ناداری کی عکاسی کرتے وقت اس کی وجوہات کی نشان دہی کی جائے تو ممکن ہے حکومت برداشت کر لے لیکن اگر اس کا علاج بیان کر دو

تو یقینی طور پر حملہ ہو جاتا ہے۔ رجعت پرست طاقتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔

اس طرح حقیقت پسندی کی معراج کو میٹیڈ سوشلسٹ حقیقت نگاری ہی ہے لیکن انجمن کے ابتدائی مسلک میں جیسا کی ان کے مینی فیسٹو سے عیاں ہے۔ یہ نہ تھا نتیجہ کنفیوژن، تطہیر اور علیحدگی کی تحریکوں نے سر اٹھالیا اس سے یقینی طور پر تحریک کو دھکا لگا اور یہ چند انتہا پسندوں کی وجہ سے ہوا۔ بقول فیض:

''حکم ہوا علامہ اقبال کا بت توڑیں، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور ن۔م۔ راشد کو علیحدہ کر دیں کہ یہ لوگ ترقی پسندی کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے ۔بھئی ہمیں بک بک لگی ۔علامہ مرحوم کے ہاں سامراج، نوجوان اور جاگیرداروں کے خلاف بے پناہ ذخیرہ ملتا ہے منٹو کے خلاف غلیظ ادب لکھنے ۔کا الزام لگایا گیا ۔نتیجہ ظاہر تھا ہماری ان سے جنگ ہوگئی۔''[۴۰]

فیض صاحب کہتے ہیں کہ ہمارا موقف واضح تھا کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کو اس کے مجموعی تاثر اور عصری تقاضوں کے تناظر میں پرکھا جا سکتا ہے لیکن اس کیے کسی ایک ادب پارے کے ایک ٹکڑے سے اس کے تخلیقی ادب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ رسکن وغیرہ اپنے دور کے ترقی پسند ادبا تھے وہ بوژوا صنعتی دور کے بے رحم میکانکی تشدد کے خلاف نعرہ لگاتے تھے وہ انسان کی عظمت اور بڑائی کے گن گاتے تھے مگر اس کا صحیح راستہ متعین نہیں کر سکے تھے۔ یہی ان کی علمی اور شعوری پس ماندگی تھی شیلی کیٹس وغیرہ کو صنعتی دور کی ہما ہمی ہرگز پسند نہ تھی وہ رومانٹک شاعر تھے لیکن انہیں رجعت پرست نہیں کہہ سکتے۔ فیض صاحب کو بہت سی شکایات تھیں اور وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

''پھر یار لوگوں نے ایک روز مظہر علی خان کے گیراج میں میٹنگ کی ۔صفدر میر صدر تھے ۔قاسمی (احمد ندیم قاسمی) صاحب (سکریٹری) نے علامہ اقبال کے خلاف ایک مقالہ پڑھا

۔بھئی ہمیں بہت رنج ہوا۔ہم نے اعتراض کیا کہ یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔آپ لوگ کیا کر رہے

ہیں یہ تو ثقہ بند قسم کی بے معنی انتہا پسندی ہے۔ہماری نہ مانی گئی ہم بہت دل برداشتہ ہوئے

اس کے بعد ہم انجمن کی محفلوں میں نہیں گئے۔''۴۱

فیض صاحب جس انداز میں ترقی پسند کی انجمن سے الگ ہوئے وہ ان کے لئے دکھ اور صدمہ کا باعث بنا اور تنظیم سے اختلاف کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ جب آپ کسی بھی تحریک کو کسی تنظیم سے وابستہ کر دیتے ہیں تو اس میں تنظیمی لحاظ سے بعض ایسے فیصلے بھی کیے جاتے ہیں جن کے متعلق اختلاف رائے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔چنانچہ آزادی کے بعد جب ہمارے سامنے نئے مسائل آئے جو پہلے پیش نظر نہیں تھے تو صاف ظاہر ہے اس میں اختلافات پیدا ہوئے اور اس میں تنظیمی طور پر بعض ایسے فیصلے کیے گئے جو ہم جیسے لوگوں کی رائے میں درست نہیں تھے اور بعض لوگ ذرا انتہا پسند ہو جاتے ہیں اور حقائق کی طرف دیکھنے کی بجائے وہ تجریدی طریقے سے چیزوں کو دیکھنے لگتے ہیں اس سے تنگ نظری اور کوتاہ بینی پیدا ہوتی ہے۔پھر بولے:

''بھئی یہ پاکستان بننے سے پہلے بھی ہوا تھا منٹو اور عصمت کے بارے میں کچھ

اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔اب منٹو کے قصہ کو ہی لے لو وہ ایم۔اے۔او کالج

امرتسر میں میرا شاگرد تھا ذہین تھا پڑھتا وڑھتا نہیں تھا۔اسے گورکی اور چیخوف کے

افسانوں کا ترجمہ کرنے کو دیا وہ خود بہت عمدہ افسانے لکھنے لگا تھا۔اس پر پاکستان

میں فحاشی کے سلسلے میں، کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، بو، اور دھواں پر مقدمات چلے

۔تین بار ہم اسے چھڑا لائے۔چوتھے مقدمے میں اسے سزا ہو گئی تھی۔اس وقت

ہم خود جیل میں تھے۔''۴۲

اس دوران فیض ترقی پسند مصنفین کی تنظیمی سرگرمیوں سے لاتعلق ہو گئے تھے۔تحریک کے مخالف لوگوں نے یہ پروپگنڈہ شروع کر دیا کہ وہ ان دونوں سے جدا ہو گئے ہیں لیکن فیض صاحب نے اس چیز کو تسلیم نہیں کیا جب ان سے ایک انٹرویو میں پوچھا گیا کہ آپ تو ۱۹۴۹ء میں اس سے علیحدہ ہو گئے تھے تو فیض صاحب نے سوال کرنے والے کو وہیں روک کر کہا:

> ''نہیں ہم علیحدہ اس طریقے سے نہیں ہوئے تھے صرف یہ ہے کہ جن چیزوں سے ہمیں اتفاق نہیں تھا ان کے بارے میں ہم خاموشی اختیار کر لی کہ ہم اس کے قائل نہیں ہیں اس زمانے میں یہ ہوا کہ پہلے علامہ اقبال کے متعلق کچھ غلط تفسیریں کی گئی۔یا منٹو،قراۃ العین حیدر،عصمت چغتائی اور ن۔م راشد کے متعلق ہماری رائے میں رویہ اختیار کیا گیا تھا۔اس وجہ سے ہم نے علیحدگی تو اختیار نہیں کی تھی کہ بنیادی طور پر تو تحریک صحیح ہے۔یہ فروعات ہیں جس حد تک اختلاف تھا اس حد تک ہم نے اس میں شریک ہونے سے انکار کیا لیکن تحریک سے تو ہم نے کبھی علیحدگی اختیار نہیں کی تھی۔''[۴۳]

دراصل فیض صاحب کے یہاں تحریک اور تنظیم کا فرق واضح رہا ہے۔مختلف موقعوں پر ان کے نظریات سے اختلاف رکھنے والوں نے گفتگو اس طریقے سے کی ہے جیسے یہ طے ہو چکا ہو کہ فیض صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہو چکے ہیں اب ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا۔فیض صاحب جو خود صحافت کی دنیا سے وابستہ رہ چکے تھے کبھی بھی اس منزل پر خاموشی اختیار نہیں کہ بلکہ بڑے واضح الفاظ میں اس کی تردید کی۔انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا نہ کرنے کے بارے میں فیض صاحب نے جو کہا کہ اس کی نشستوں انتہا پسندی نمایاں ہونے لگی تھی۔خصوصاً علامہ اقبال پر

تنقید کا انہوں نے نوٹس لیا تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔

میری رائے میں فیض کو جس چیز نے صدمہ پہنچایا تھا وہ انتہا پسندی تھی جسکی وجہ سے وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا نہ کر رہے تھے۔

فیض صاحب اور اداریہ نویسی:

فیض صاحب نے اپنی صحافتی زندگی میں خوب محنت کی۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے "پاکستان ٹائمز" میں اداریہ نویسی کا انوکھا انداز اختیار کیا۔ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے فیض صاحب نے بتایا کہ جولائی ۱۹۴۷ء میں سی - آئی-ڈی کے چیف مسٹر ڈبلیو این پی جین کن کا ایک اہم خط ہمارے ہاتھ لگ گیا۔کہنے لگے:

> ''ہم پاکستان ٹائمز کے دفتر میں اپنے کمرے میں تھے ایک انجان شخص ملاقات کرنے کے لئے آیا بولا جناب یہ سربہ مہر چھٹی ہے۔سی۔آئی۔ڈی کے چیف نے مجھے اسے گورنر (پنجاب) صاحب کے پاس دستی پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ہو نہ ہو اس میں کچھ ہے یہ خاص چٹھی لگتی ہے میں یہ آپ کے پاس لے آیا ہوں۔''[۴۴]

فیض صاحب نے بتایا کہ انہوں نے اس خط کو طریقے اور سلیقے سے کھولا۔اس خط میں لکھا تھا کہ برصغیر کی تقسیم سے پاکستان میں انگریزی مفادات کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور یہ کہ باؤنڈری کمیشن کے فیصلوں سے مسلمان ضرور پریشان ہوں گے۔پھر اس کی نقول تیار کرائیں اور اصل خط کو دوبارہ بند کر کے قاصد کے حوالے کر دیا اور ہم نے مناسب وقت پر یہ خط ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد وزیر اعظم لیاقت علی خان کو دکھانے کا ارادہ کر لیا اس سلسلے میں کراچی پہنچے۔وزیر اعظم کو خط پیش کیا پڑھ کر کہنے لگے کہ وہ ان حالات سے آگاہ ہیں۔پھر ہم لاہور لوٹ کر پاکستان ٹائمز چلانے میں مشغول ہو گئے کچھ عرصہ

تک وزیراعظم لیاقت علی خان کی جانب سے ردعمل کا انتظار کیا۔ جب کسی جانب سے کوئی کاروائی نہ ہوئی تو ہم نے اس خط کو اصل حالت میں ۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان ٹائمز میں چھاپ دیا اور ساتھ ہی "spy Ring" کے نام سے اداریہ لکھا لیکن حکومت کی طرف سے کوئی جوابی کاروائی نہ ہوئی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کے بہیمانہ قتل پر پورے ہندوستان پر دکھ درد کا اندھیرا چھا گیا۔ فیض صاحب بھی بے حد دکھی ہوئے۔ انہوں نے مہاتما گاندھی کے بہیمانہ قتل پر اداریہ لکھتے ہوئے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اسی طرح ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی شام فیض صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھے کہ انہیں ٹیلی فون پر انہیں اطلاع دی گئی کہ قائداعظم رحلت فرما گئے ہیں وزیراعظم لیاقت علی خان کے آفس کی طرف سے ابھی تک کوئی اعلانیہ جاری نہیں ہوا تھا اور فیض صاحب نے واپس لوٹ کر دوستوں کو یہ خبر سنائی طے پایا سب دفتر چلتے ہیں اور قائداعظم کی وفات پر پاکستان ٹائمز اور امروز کا خصوصی نمبر تیار کرتے ہیں۔ ساری رات فیض صاحب اور ان کے دوست پاکستان ٹائمز اور امروز کا قائداعظم کا خصوصی ماتمی شمارہ تیار کرنے میں مصروف رہے۔ رات گئے قائداعظم کی وفات کا سرکاری اعلان ہوا۔ پاکستان ٹائمز واحد روزنامہ تھا جو اس اعلان کے نصف گھنٹہ میں اس خبر کی شہ سرخیوں کے ساتھ سڑکوں پر تھا۔ تو اس وقت بھی سب سے پہلے فیض صاحب نے قائداعظم محمد علی جناح کو آخری خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اداریہ To God We Return میں لکھا۔

''یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ عین اس موقع پر برصغیر کے دو بے حد عاقل (Wisest) اور بیحد مرقع انسانوں سے دونوں ممالک محروم ہو گئے۔''[۴۵]

راولپنڈی سازش کا انکشاف اور فیض کی گرفتاری:

۹ مارچ ۱۹۵۱ء کی صبح سویرے ایک انجانے قسم کے شور نے فیض اور ایلس کو نیند سے اس طرح بیدار کیا کہ پہلے پہل سمجھ نہ سکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر مسلح پولیس والے آئے اور فیض کو گرفتار کر کے لے گئے۔ اس وقت ایلس کو خبر نہ تھی کہ فیض صاحب کو کہاں لے جا رہے ہیں اور ان کی واپسی کب تک ہوگی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے ریڈیو پاکستان سے تقریر کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا:۔

''لاہور ۹ مارچ ۱۹۵۱ء پاکستان کے دشمنوں کی تیار کردہ ایک سازش کا انکشاف بھی ہوا ہے۔ اس سازش کی غرض و غایت یہ تھی کہ متشدد ذرائع سے ملک میں ہلچل پیدا کی جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے پاکستان کی دفاعی فوجوں کی وفاداری ختم کر دی جائے۔ حکومت کو اس سازش کا علم بروقت ہو گیا۔ چنانچہ آج سازش کے سرغنہ لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا جو میجر جنرل اکبر خاں چیف آف دی جنرل سٹاف، بریگیڈیر ایم۔اے لطیف (بریگیڈیر کمانڈ کوئٹہ)، مسٹر فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز اور بیگم اکبر خاں (اہلیہ میجر جنرل اکبر خاں) پر مشتمل ہیں۔''[۴۶]

ڈاکٹر ایوب مرزا سے اس انٹرویو "راولپنڈی سازش کا انکشاف اور فیض کی گرفتاری" کے ضمن میں یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی سازش کا انکشاف ہوا تھا۔ اس کی تصدیق اشفاق حسین اپنی کتاب ''فیض احمد فیض، شخصیت اور فن'' میں بھی کر چکے ہیں۔ وزیر اعظم کی اس تقریر کے بعد پورے ملک میں بد امنی کی فضا طاری ہوگئی، اخبارات، سیاسی جماعتیں اور حکومت کے کارپردازوں نے سازش میں گرفتار ہونے والوں کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا تھا۔ کہ ان غداروں کو فوری طور پر سزا دی جائے۔ چونکہ لوگوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ سب لوگ ان کی سزا کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جبکہ اس کے برعکس ایک آواز بلند ہوئی۔ نوائے وقت کے مدیر اعلیٰ اور فیض کے پرانے ساتھی حمید

نظامی نے نہایت جرات مندانہ موقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ بے شک ان قیدیوں پر مقدمہ چلایا جائے اور انہیں صفائی کا موقع بھی فراہم کیا جائے ، ورنہ انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے اور انہیں بغیر کسی جرم کے سزا دینا ٹھیک نہیں ہوگا۔ نوائے وقت نے فیض صاحب کے بارے میں لکھا۔

''جرم ثابت ہو نہ ہو وہ الگ بات ہے، لیکن جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ اتنا برا نہیں ہے۔''[۴۷]

اس سازش کے انکشاف نے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ خبر پورے ملک میں بم کی طرح پھٹی جس کی شدت بیرون ملک میں بھی محسوس کی گئی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۱۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو ''پاکستان ٹائمز'' نے یہ خبر شائع کی۔

''چیف آف جنرل اسٹاف کو گرفتار کر لیا گیا۔ بریگیڈیر لطیف اور فیض کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ مبینہ سازش کے ذریعے ''تشدد آمیز فضا'' کو جنم دینا تھا۔ پرائم منسٹر کا اعلان''[۴۸]

فوجی سازش کے انکشاف کا اثر ملک کے کونے کونے میں پھیل گیا۔ ریڑھی بان سے لے کر ٹریڈ یونین کے کارکن بھی حیران تھے کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔

راولپنڈی سازش کیس:

۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کا جو بیان جاری ہوا جس میں سازش کے پکڑے جانے کا انکشاف ہوا۔ اس میں ملوث لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کا انٹرویو لیا جس میں وہ راولپنڈی سازش کی بات کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ایک پولیس افسر کیانی نے پشاور میں آئی۔ آئی چندریگر گورنر این ڈبلیو

فرنٹیئر پراونس کوایک منصوبے کے متعلق خبر دی حالانکہ اس کے مصنف سکندر مرزا اور ایوب خان تھے۔ قیام پاکستان کے بعد حالات کافی سنگین تھے سیاسی قیادت جاگیرداروں کی اکثریت پر مشتمل تھی جبکہ وزیراعظم برطانیہ اور امریکہ کو اپنی مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ ملک کے داخلی حالات بھی خاصے پریشان کن تھے پچھلے کئی برسوں سے سیاسی آزادیوں پر پابندی لگائی جارہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ملک کو اقتصادی طور پر بھی کافی مسائل کا سامنا تھا۔ کشمیر کے محاذ پر شکست ہوئی تھی جس کی وجہ سے فوجی افسران میں مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا جس راولپنڈی سازش کیس کا ذکر کرتے ہیں اگر دیکھا جائے تو راولپنڈی سازش کیس کے اسیران خود ایک بڑی سازش کا شکار ہورہے تھے۔ اس لیے زیادہ مناسب لگتا ہے کہ معاملے کی تہہ تک پہنچا جائے۔ تقسیم کے بعد جنرل گریسی پاکستان میں برطانوی طرز کے وفادار افسروں میں سے تھے اور اس نے جانے سے پہلے ہی ایوب خان کو اطلاع دے دی تھی کہ فوج میں ''ینگ ترک پارٹی'' موجود ہے اس وقت ایوب خان بھی ترقی کر چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ڈیفنس سکریٹری تھا، جنوری ۱۹۵۱ء میں کمانڈر انچیف بنا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض احمد فیض کو پاکستان ٹائمز کی ادارت سے ۱۵ مارچ ۱۹۵۱ء کو معطل کر دیا تھا۔ ایوب خان کا خیال تھا کہ سازش میں جتنے بھی لوگ ملوث ہیں

''ان کا کورٹ مارشل کیا جائے مگر دشواری یہ تھی کہ اس میں چند سویلین بھی شامل

تھے۔''[۴۹]

اس سازش میں ملوث ملزموں کی تعداد ۱۵ ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے راولپنڈی سازش کے متعلق جن دستاویزات کا ذکر کیا ہے وہ اکبر خان کے گھر سے برآمد ہوئی تھیں اور جسے بنیاد بنا کر سازش کا انکشاف کیا گیا تھا۔ اس میں ایسی کوئی باتیں نہیں تھیں جس پر ایک کیس بنا دیا جائے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ایک اقتباس شامل کیا ہے جس جنرل اکبر خاں نے اپنی کتاب ''ریڈرز ان کشمیر'' واضح الفاظ میں لکھا ہے:

''۲۳ فروری ۱۹۵۱ء کی سات گھنٹے کی میٹنگ میں غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا

کہ مجوزہ ایکشن نہیں لیا جائے گا۔''۵۰

جبکہ اس حوالے سے ظفر اللہ پوشنی نے اپنی کتاب ''زندگی زندہ دلی کا نام ہے'' کے آخر میں ''ریڈران کشمیر'' میں لکھا ہے کہ

''۲۲ فروری ۱۹۵۱ء کو ان کے گھر جو میٹنگ ہوئی۔ اسی کو بعد میں راولپنڈی سازش کیس کا نام دیا گیا۔ یہ میٹنگ سات گھنٹے جاری رہی اور آخر میں یہ طے پایا کہ جس قدم کی تجویز پیش کی گئی تھی اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔''۵۱

یہاں پر جو اہم بات ہے ڈاکٹر ایوب مرزا نے تاریخ ٹھیک نہیں بتائی جبکہ ظفر اللہ پوشنی نے ۲۲ فروری بتائی ہے۔ میرے خیال میں یہ تاریخ درست ہے یہ ایک مستند حوالہ ہے۔ جنرل اکبر خاں نے یہ بھی کہا تھا کہ کسی شخص پر گولی نہیں چلائی جائے گی اور اس اجلاس کے آخر میں یہ بھی طے پایا تھا کہ کشمیر پر کسی قسم کی کاروائی نہیں کی جائے گی اور پاکستان میں ایسی حکومت کے قیام کی ضرورت ہے جو ملک کی خیر خواہ ہو۔ اس سلسلے میں فیض صاحب لکھتے ہیں:

''قصہ صرف اتنا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک دن بیٹھ کر بات کی کہ اس ملک میں کیا ہونا چاہیے۔ کس طریقے سے یہاں کے حالات بہتر بنائے جائیں۔ ملک کو بنے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ یہاں آئین ساز سیاست کا ڈھانچہ ٹھیک طرح سے منظم نہیں ہوا تھا۔''۵۲

چونکہ فیض صاحب کے جنرل اکبر خاں اور ان کی بیگم سے اچھے مراسم تھے۔ اس لیے ان کی گفتگو میں بھی شریک ہوئے حالانکہ انہوں نے ساری منصوبہ بندی خود کی اور فیض صاحب سے کہا ہماری بات سن لیں تو فیض صاحب نے ان کی بات سن لی۔ پھر اس میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکومت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے لیکن پھر بھی مقدمہ بنا۔

میری رائے میں اس قصے کا پس منظر اتنا ہے کہ جنرل اکبر خاں جو کہ فیض صاحب کے دوست تھے اور وہ پاکستانی فوج میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھے تقریباً چیف آف جنرل سٹاف تھے۔ یہ لوگ ملک کے خیر خواہ تھے۔ ان پر الزام لگایا گیا تھا کہ یہ لوگ فوج میں افراتفری پھیلا کر ملک میں انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں ایوب خاں کمانڈر انچیف تھے اور وزیر اعظم لیاقت علی خاں تھے وہ سمجھتے تھے کہ بغاوت ایک سازش ہے جو کمیونسٹ انقلاب لانے والے لوگوں نے کی ہے اور فیض صاحب چونکہ فوج میں رہ چکے تھے کچھ لوگوں سے سیاسی نظریات میں ہم آہنگی بھی تھی۔ یہ ساری وجوہات تھیں جن کہ وجہ سے ان پر کیس بنایا گیا۔

فیض کی نظر بندی کے دوران گھریلو حالات:

فیض صاحب کے جیل جانے کے بعد ان کے مالی حالات کافی تنگ ہو گئے تھے۔ کیونکہ بچیاں بڑی ہو رہی تھیں ساتھ ہی ان کی ضروریات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ فیض صاحب سے ملاقات پر جانے کے لیے اضافی خرچہ درکار تھا۔ ان تمام اخراجات کو پورا کرنے کے لیے نئی حکمت عملی اپنائی اور ان تمام ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے نوکری کر لی ۔ بچیوں کو غربت کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ایوب مرزا کا ایک انٹرویو شامل ہے انہوں نے میز و سے پوچھا کہ ابو کے جیل جانے کے بعد تمہیں گھر میں کبھی روپے پیسے کی کمی کا احساس ہوا تھا۔ وہ بولی اس وقت ممی نے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔ ہاں البتہ گھر میں ابو کی بڑی کمی محسوس ہوتی تھی۔ حالانکہ میں اس وقت کافی چھوٹی تھی ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ فیض صاحب کے جیل جانے کے بعد منیزہ اور سلیمہ کی پڑھائی کافی متاثر ہوئی تھی۔ منیزہ اردو میں خاصی کمزور تھی صوفی تبسم صاحب نے اسے اردو میں تیز کر دیا تھا جبکہ سلیمہ کا حساب اور اردو کافی بگڑ چکا تھا۔ ایلس کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کی پڑھائی میں کسی قسم کا حرج نہ ہو اور وہ پاکستان ٹائمز کے دفتر سے نظام صاحب کو لے آئیں جنہوں نے سلیمہ کو اردو

اور حساب میں طاق کر دیا۔ سلیمہ کہتی ہے کہ ہم نے انہیں کبھی فیض صاحب کے حلقہ احباب میں نہیں دیکھا تھا وہ ایسے موقع پر فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ جب اپنوں نے ہم سے منہ موڑ لیا تھا۔ ایک اور مشکل جس کا میں یہاں ذکر کروں گی وہ یہ کہ فیض صاحب سے جیل میں ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ملاقات کے لیے اجازت نامہ بڑی کوشش کرنے کے بعد تین ماہ کے وقفے کے بعد ملتا تھا۔ یوں فیض صاحب کی قید کے دوران ایلس کو بہت سی مشکلات کا سامنا کیا انہیں یقین تھا کہ ایک دن فیض صاحب گھر لوٹ آئیں گے اور یہ ساری پریشانیاں بھول جائیں گی۔

جیل سے خطوط:

جیل کے خطوط اپنی نوعیت کا تاریخ ادب میں پہلا تجربہ ہی نہیں بلکہ مختلف لوگوں کے تجربات مختلف صورت حال اور ان کی زندگی کا نظریہ اور تجربہ سامنے لاتے ہیں۔ اسی طرح فیض صاحب کے خطوط ''صلیبیں مرے دریچے میں'' اپنی نوعیت کا ایک انوکھا تجربہ ہیں۔ یہ ایک نثری دستاویز ہے۔ اس دستاویز سے ہمیں فیض صاحب کی جیل کی شاعری کے محرکات اور ان کی زندگی کے مختلف رویوں یعنی ہمدردی وغم خواری، جرات مندی جیسے رویوں پر روشنی ملتی ہے۔ یہ خطوط انگریزی زبان میں تحریر کیے گئے تھے۔ ان کے جوابات بھی ایلس نے انگریزی میں ہی لکھے تھے۔ ایلس کے خطوط ''ڈیر ہارٹ ٹو فیض ان پریزن'' کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے فیض صاحب کی ایلس کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے اور ایک دوسرے کی مدد اور حوصلہ مندی نے زندگی کے مشکل ترین وقت کو کاٹنے میں کس طرح مدد کی۔ ایلس کے نام فیض کے خطوط ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آ گئے تھے۔ مرزا ظفر الحسن نے فیض صاحب سے ان کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کروایا تھا۔ اس لیے ہم اردو ترجمے میں فیض صاحب کے اسلوب کی خاص جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ اس کتاب کے آغاز ''گزارش احوال واقعی'' میں فیض صاحب لکھتے ہیں:

''مجھے ان خطوط کی اشاعت کا ایک ہی جواز نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ ہمارے بہت سے لوگوں کے لیے قید و بند کوئی غیر متوقع سانحہ یا حادثہ نہیں بلکہ معمولات زندگی میں داخل ہے۔اس لیے بہت ممکن ہے کہ ہمارے شعبہ عمرانیات میں حبسیات" بجائے خود ایک موضوع تحقیق ٹھہرے۔اس صورت میں شاید خطوط طویل اسیری کے نفسیاتی تجربے کا ایک آدھ پہلو اجاگر کر سکیں۔''۵۳

بے شک ان خطوط سے ہمیں فیض کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کی طرف اشارے ملتے ہیں اور دوسری اہم بات ان خطوط کے ذریعے معلوم ہوتی ہے جیل سے یہ ایک محتاط حکمت عملی کے تحت تحریر کیے جاتے رہے کیونکہ سیاسی نظر بندوں کی ملاقاتوں اور ان کے خطوط کا جائزہ سی آئی ڈی خوب لیتی ہے۔اس لیے سیاسی مقدمے میں ملوث نظر بند دوسرے مجرموں، بے گناہ قیدیوں سے الگ رکھا جاتا ہے۔تاکہ وہ جیل کے روزمرہ کے پرتشدد رویوں کو قریب سے نہ دیکھ سکیں۔یہی وجہ ہے کہ فیض صاحب اپنے خطوط میں محتاط رویہ اپناتے ہیں۔

مرزا ظفر الحسن نے خطوط مہینوں اور سالوں کی ترتیب سے شائع کیے اور کتاب میں گراف بھی پیش کر دیا ہے۔جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۷ جون ۱۹۵۱ء سے ۲۵ جون ۱۹۵۳ء تک ایلس کے نام خطوط حیدر آباد جیل سے تحریر کیے گئے اور یہ تعداد میں ۹۲ ہیں باقی خطوط کراچی جیل اور جناح ہسپتال کراچی سے ۱۹۵۳ء میں لکھے گئے اور ان کی تعداد آٹھ ہے۔مزید ۳۵ خطوط (منٹگمری) ساہیوال جیل سے لکھے گئے ہیں۔اس طرح کل ۱۳۵ خطوط ہیں۔آخر میں چھیمی اور میزو کے نام خطوط کے اقتباسات بھی شامل کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار کیے گئے اور انہوں نے پہلا خط ۷ جون ۱۹۵۱ء کو حیدر آباد جیل سے لکھا۔فیض صاحب کو جیل میں حراست کے ابتدائی مہینوں میں سخت قید تنہائی میں رکھا گیا اور ان کو

دوسرے لوگوں سے ملنے بھی نہیں دیا جاتا تھا۔خط و کتابت پر سخت پابندی لگا دی تھی۔ اس کی تصدیق میں سبط حسن لکھتے ہیں:

''فیض صاحب نے تین مہینے لائل پور جیل میں سخت قید تنہائی میں گزارے۔ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار، خطوط، ان کو کسی چیز کی اجازت نہیں تھی۔''۵۴

قید تنہائی میں اسی سخت گیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیض صاحب نے کہا تھا:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے

اگر ہم قید کے دوران لکھے گئے ان خطوط کا تجزیہ کریں تو فیض صاحب کا ایک واضح نظریہ حیات ہمارے سامنے آتا ہے۔ بے شک وہ قید تنہائی میں تھے اس کے باوجود رجائیت جنم لیتی ہے۔ایک پرامیدی ہمیں ان کے خطوط میں دیکھنے کو ملتی ہے۔فیض صاحب نے اسیری کے دوران شاعری کا مجموعہ ''زنداں نامہ'' بھی تحریر کیا۔زنداں نامہ کے سرآغاز میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ ''زنداں نامہ'' کی بیشتر نظمیں منٹگمری جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران تحریر کیں یعنی جولائی ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کی لکھی گئی چیزیں اس میں شامل ہیں۔قید کے دوران فیض صاحب نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا۔ان میں سب سے زیادہ واضح پہلو فیض کی رجائیت ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''رجائیت'' اور ''اطمانیت'' فیض صاحب صاحب کی زندگی اور کلام کے دو بڑے اجزائے ترکیبی ہیں اور قید انسانی زندگی کا اہم حصہ ہے۔جس کو بڑے بڑے لوگ بھی برداشت نہیں کر سکتے لیکن دوسری طرف فیض صاحب ہیں جو اپنے مخاطبین کو زندگی کے روشن کے مثبت اور روشن پہلوؤں کی طرف لے جاتے ہیں۔سید سجاد ظہیر نے یوں اظہار خیال کیا ہے۔

''اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا

حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو اپنی فیاضی سے مرصع کر دیتا

ہے اور اپنی نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیتا ہے تو کبھی میرا

ذہن اس کے تخیل کی شاداں اور فرحاں گل کاریوں سے کسب شعور کرتا جہاں جدید

علم کی ضیا پاشیاں انسانیت کے شریف ترین جذبات سے اس طرح گھل مل گئی ہیں

جیسے شعاع مہر سے تمازت''۵۵

ہم سب جانتے ہیں کہ جیل کی زندگی بہت مشکل ہوتی ہے۔انسان اپنے گھر، بیوی بچوں سے دور ہوتا ہے لیکن فیض صاحب پر مسرت تھے۔اور انہیں امید تھی کہ آخر ایک دن جیل کی زندگی ختم ہو جائے گی۔پھر وہ آزاد ماحول میں زندگی بسر کر سکیں گے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے ایلس کو لکھا ہمارے دوست سرجیت سنگھ نے کہا تھا۔

''from with in "peace comer اگر وہ یہاں ہوتے تو میں

انہیں بتاتا کہ اس کے صحیح معنی کیا ہیں۔''۵۶

اس سلسلے میں فیض صاحب کا اپنا خط شامل ہے۔وہ ایلس کو لکھتے ہیں کہ تمہارے بچے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔مجھے اس بات کا قلق ہے کہ میں انہیں اپنے سامنے بڑا ہوتا نہیں دیکھ سکتا لیکن مجھے یہ اطمینان ضرور ہے کہ تم ان کی اچھی طرح پرورش کرو گی۔اگر ان میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ کیا چیز باعزت ہے اور کیا نہیں ہے تو وہ جیسے بھی اپنی زندگی گزاریں ٹھیک ہے۔ہمارے ایک دوست سرجیت سنگھ نے کہا تھا کہ''peace comes from within'' اگر وہ یہاں موجود ہوتے تو میں انہیں بتاتا اس کے کیا معنی ہیں۔اب مجھے پتہ چلا ہے کہ اگر اپنے دل میں جرم و گناہ کا کوئی احساس نہ ہو تو آدمی تکلیف، دکھ درد اور سب پریشانیاں، سب سختیاں اور قید و بند کی صعوبتیں اور بھی بہت کچھ برداشت کر سکتا ہے۔جو باہر سے اس کی ذات پر مسلط کر دی جائیں۔صرف گناہ کا احساس، خطا کاری کا احساس یا پھر اپنے آپ کو دھوکہ دینا ایک ایسی چیز

ہے۔جس کا کوئی مداوا،کوئی علاج نہیں ہے کیونکہ یہ داخلی چیز ہے اور اس کا احساس زندگی بھر ختم نہیں ہوتا۔اس کے خلاف اگر اپنی بے گناہی اور نیکی پر یقین ہو جیسا کہ مجھے اور تمہیں ہے۔ڈاکٹر ایوب لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے ایلس کو لکھا:

''نہ صرف مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی جسے اخلاقی طور سے گناہ کہہ سکیں، بلکہ کوئی ایسا ارتکاب بھی نہیں کیا جسے رسمی یا قانونی طور سے جرم ٹھہرایا جا سکے۔''۵۷

فیض صاحب نے ایلس کو لکھا کہ جب سے میں جیل میں آیا ہوں۔یہاں مجھے کوئی خوف اور ڈر نہیں ہے بلکہ میں مطمئن ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں میں نے کوئی ایسا جرم یا گناہ نہیں کیا جس کی وجہ سے مجھے مجرم ٹھہرایا جا سکے۔یوں لگتا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے یہاں آئے ہی۔اگر باہر جانا چاہیں تو کوئی ہم پر پابندی نہیں لگا سکتا۔ایک طرف سے اس بات کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے جو ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی کتاب میں لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ کتنے مشکل حالات تھے فیض صاحب نے گلہ تک نہیں کیا یہ بڑے دل کی بات ہے۔فیض صاحب کو یہ مقام اس کی انسان دوستی نے عطا کیا ہے۔انسان دوستی کا یہ جذبہ اس کی رگ و پے میں جذب ہو کر اس کے خون کا حصہ بن گیا ہے۔اس کی شخصیت کی اس انسان دوستی کے بغیر کوئی پہچان نہیں ہے۔فیض کی پہچان،فیض کا تشخص اور فیض کا آدرش ہی انسان دوستی ہے۔پھر فیض صاحب کے نجی خطوط کے اقتباسات ان کی مکمل جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ اپنی شادی کی دسویں سالگرہ کے موقع پر جیل میں ایلس کا خط وصول کرنے کے بعد فیض صاحب نے ایلس کو لکھا:

''آج۔۔۔۔بڑی راحت ہوئی کہ ان دس برسوں میں دونوں نے بہت سا سکھ اور تھوڑا سا دکھ بھی دیکھا ہے۔دس برس کے یہ ایام دونوں نے دیانت داری اور سکون خاطر سے گزارے ہیں۔یہ دس برس ایسی دولت ہیں اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔''۵۸

فیض صاحب ایلس سے کہتے ہیں کہ تو آؤ ان بیتے ہوئے دنوں کا شکرانہ ادا کریں۔ یہ ایک ایسی دولت ہے جسے ہم سے کوئی چھین بھی نہیں سکتا جبکہ فیض صاحب نے شادی کی سالگرہ کی جو تاریخ لکھی تھی وہ درست نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ فیض صاحب کو سالگرہ کی تاریخ یاد نہیں رہتی تھی۔ ایلس کو لکھتے ہیں کہ تمہارا دوسرا خط مجھے ابھی ملا اور امید ہے کہ میرا پہلا خط پہنچ گیا ہوگا۔ بقول فیض:

''میرا خیال ہے کہ میں نے ہماری شادی کی سالگرہ کی تاریخ پھر غلط لکھی۔ لیکن اب کے ایک ہی دن کا فرق تھا۔ خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ دن تنا اہم نہیں جتنے وہ شب و روز ہیں جو اس دن کے بعد آئے۔''۵۹

فیض صاحب اپنی نجی زندگی سے بہت مطمئن تھے۔ ایلس نے جواں مردی کے ساتھ ان کے شانہ بشانہ تمام مسائل کو حل کرنے میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ فیض صاحب قید کے دوران بھی مسلسل کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ جس شوق اور لگن سے وہ کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتابوں کے رسیا تھے۔ ایام اسیری کے دوران سجاد ظہیر سے انہوں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھنا شروع کر دی تھی۔ مطالعے کا اتنا شوق تھا کہ ایلس کو لکھتے ہیں:

''میں نے کتابوں کی جو فہرست بھیجی تھی اس میں ایک عربی کتاب کا اضافہ کر دینا جو مجھے درکار ہے اور دستیاب ہو سکے تو باقی کتابوں کے ساتھ بھجوا دینا۔ کتاب کا نام ہے دیوان الحماسہ اور مصنف کا نام ہے ابو تمام۔ اس کے علاوہ جتنے اردو دیوان مل سکیں بھجوا دو۔ گھر میں بہت ہوں گے۔ نذیر یا کسی اور دوست سے کہو کہ انتخاب کر دیں۔''۶۰

فیض صاحب نے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد عربی میں بھی ایم اے کیا تھا۔اسی لیے وہ عربی کتب میں بھی دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ میاں افتخارالدین جب فیض صاحب سے ملنے گئے تھے تو کافی سارے رسائل بھی ساتھ لے گئے تھے مگر ان کے مطالعے کی پیاس نہ بجھی اور انہوں نے ایلس سے مزید اور کتابیں منگوالیں:

''فرانسیسی کی کچھ کتابیں اور لغات بھجوادو۔بنے نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں فرانسیسی ضرور پڑھائیں گے۔یہاں دماغی کام کچھ زیادہ جی نہیں لگتا لیکن اپنی سی کوشش ضرور کریں گے۔مجھے پڑھنے کا ایک لیمپ بھی چاہیے اگر گھر میں کوئی زائد لیمپ ہو تو بھجوادو۔''[۶۱]

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ جیل میں اکثر فیض صاحب انڈیا ریڈیو سنا کرتے تھے۔فیض صاحب نے جس شوق سے فرانسیسی کا مطالعہ شروع کیا تھا اس سے جلد ہی اکتا جاتے ہیں۔پھر وہ فرانز کافکا اور اپٹن سنکلیر کے ناول ''دی جنگل'' کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں اور اس پر اپنے تنقیدی نکتہ نظر کا بھی اظہار کرتے ہیں۔پھر فیض صاحب کا چیخوف کے ڈرامے "Three sisters" پڑھنے کا دل کرتا ہے تو وہ ایلس کو کہتے ہیں کہ کالج کے زمانے میں پڑھے تھے۔اگر کہیں سے مل سکیں تو بھجوادو دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں۔اس کے ساتھ ہی فیض صاحب ایلس کو ''اخبار پاکستان ٹائمز'' کے حوالے سے مشورے بھی دیتے ہیں۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے ایلس کو خط لکھا کہ میں جیمس ایلڈرج کا ناول ''ڈپلومیٹ'' پڑھ رہا ہوں اس کو Bodley Head نے شائع کیا ہے۔تم بھی یہ کتاب کہیں سے حاصل کر کے پڑھو۔اس جیسی کتاب میں نے پہلے کبھی نہیں پڑھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ جیل میں فیض صاحب اکثر انڈیا ریڈیو سنا کرتے تھے۔ہمارے پاکستانی ریڈیو پر جو موسیقی کہلاتی ہے۔وہ تو فضول ہے ہمارے سب اچھے موسیقار برکت علی خان، رفیق (غزنوی)، پکھراج (ملکہ) وغیرہ پر

تو پابندی لگادی ہو۔ایک دن فیض صاحب نے دہلی سے ہندوستانی موسیقی سننے کے لیے ریڈیو کھولا تو اس دور کے سب سے بڑے وائلن نواز یہودی مینوہن انڈین فیسٹیول ہال میں وائلن پر باخ اور پاگانینی کے نغمے بجا رہے تھے۔فیض صاحب حیران تھے کہ اس ملک کو بنے ہوئے پانچ برس گزر چکے ہیں۔اس عرصے میں ہم نے اپنے ملک کے کچھ نہیں کیا سوائے فساد برپا کرنے کے۔وہ ایلس کو خط لکھتے ہیں جس سے ڈاکٹر ایوب مرزا کے خطوط کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔بقول فیض:

''ہندوستان ہم سے بڑا ملک سہی لیکن کلچر یا تہذیب کا تعلق ملک کے سائز سے نہیں
ہوتا۔سوچنے اور رہنے سہنے کے آداب واطوار سے ہوتا ہے۔''۶۲

اگر ہمارا ملک ترقی یافتہ نہیں ہے تو کم از کم کسی ملک کی تہذیب،اس کے کلچر کے نمونے تو دیکھ سکتے ہیں۔فیض صاحب کو قومی تہواروں اور میلوں سے بھی خاصی دلچسپی ہے۔فیض صاحب نے جیل میں فلسفے کا مطالعہ بھی شروع کیا۔نطشے کی کتاب پڑھتے ہیں اور اس پر اپنی تنقیدی آرا بھی دیتے ہیں۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے ایلس کو لکھا:

''ایک نظم بھیج چکا ہوں۔دو اور لکھ چکا ہوں۔کچھ متفرق نظمیں اور اشعار تھے جواب
مکمل ہو چکے ہیں۔''۶۳

اس سلسلے میں فیض صاحب کا خط شامل ہے جس سے ایوب مرزا کے نیان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔فیض نے ایلس کو بتایا کہ ایک نظم بھیج دی ہے۔دو اور تحریر کر چکا ہوں۔کچھ متفرق نظمیں اور اشعار تھے جواب وہ بھی مکمل کر لیے ہیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کو اپنے بڑے بھائی سے بے حد محبت تھی۔طفیل احمد فیض صاحب سے ملنے کے لیے حیدر آباد جیل کے لیے روانہ ہوئے اور انہیں ملاقات سے پہلے صبح کی نماز ادا کرتے ہوئے ہارٹ اٹیک ہوا اور فیض کو مردہ بھائی کی ملاقات کے لیے بلایا گیا۔فیض صاحب کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔انہوں نے ایلس کو لکھا۔

'' میں نے اپنے غم کے غرور میں سر اونچا رکھا اور کسی کے سامنے نظر نہیں

جھکائی۔''۶۴

فیض صاحب نے اپنے بھائی کے لیے نوحہ بھی لکھا:

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ جاتے ہوئے

لے گئے ساتھ مری عمر گذشتہ کی کتاب

فیض صاحب اپنے بھائی کی موت کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنی والدہ کے غم کے سبب سب دکھی ماؤں کے غم کو محسوس کرتے اور اسے اپنا غم سمجھتے ہیں۔ اپنے باقی خطوں میں وہ موسم کا تذکرہ کم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذاتی معاملات، معاشی مسائل اور تنگ دستی میں ایلس کو ثابت قدم رہنے اور صبر و تحمل سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ فیض صاحب کے خطوط میں ایسی بہت ساری باتیں ہیں جو ان کی شاعری کو جلا بخشتی ہیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایام اسیری اور دست صبا:

فیض صاحب نے جیل میں کوئی کم عرصہ نہیں گزارا اور اس دوران ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ کلام ''دست صبا'' کی اشاعت کی خبر ملی۔ یہ خبر سن کر ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا بلکہ فیض صاحب ہی نہیں ان کے تمام ساتھی اس خوشی میں برابر کے شریک تھے۔ سجاد ظہیر نے ''دست صبا'' کے بارے میں کچھ یوں اظہار خیال کیا ہے۔

''مقدمہ ''سازش راولپنڈی'' کے دنوں میں فیض کے ساتھ میں بھی سنٹرل جیل

(حیدر آباد، سندھ) میں تھا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء تک ہمارے مقدمے کی سماعت ختم ہو چکی

تھی۔ہمیں روز روز سپیشل ٹریبونل کے اجلاس میں گھنٹوں بیٹھے رہنے اور اس دوران گواہوں کی شہادتوں، وکیلوں کی جرح اور بحث اور معزز ججوں کی فاضلانہ قانونی موشگافیوں سے نجات مل گئی تھی۔ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور ہم امید وبیم کے عالم میں تھے''چھٹی'' وافر تھی۔انہی دنوں ایک دن یہ اطلاع ملی کہ''دست صبا'' شائع ہوگئی۔''[۶۵]

مزید بتاتے ہیں کہ ہم لوگ اس کی تمام چیزیں پہلے ہی فیض صاحب سے سن چکے تھے اور ذہن نشین بھی کر چکے تھے۔ایک دن جیل کے حکام سے اجازت لے کر ایک پارٹی بھی کی۔اس موقع پر تمام قیدیوں نے فیض صاحب کو مبارک باد بھی دی۔فیض صاحب نے''دست صبا'' کا انتساب کلثوم کے نام لکھا۔ایلس کے نکاح کے وقت ان کی والدہ کا دیا ہوا اسلامی نام کلثوم رکھا گیا تھا۔جیل کی زندگی میں جس طرح ایلس نے فیض صاحب کا ساتھ دیا تھا اور قدم قدم پر ان کی دل جوئی کی۔اس کے بعد تو ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایلس سے زیادہ اس کتاب کے انتساب کا کسی اور کو حق نہیں پہنچتا۔۲نومبر ۱۹۵۲ء کے خط میں فیض نے ایلس کو لکھا:

''رہی انتساب کی بات تو اگر تم اپنے آپ کو ایلس کہنا چاہتی ہو تو تمہیں اختیار ہے اس لیے کہ کتاب بھی تمہاری ہے۔میں نے کلثوم اس لیے لکھا تھا کہ اول تو یہ مشرقی نام ہے۔دوسرے یہ کہ اس کے بارے میں تم سے ضرور سوال کریں گے جو شاید تمہارے لیے تفریح طبع کا سامان ہو۔بہر حال جو تمہارا جی چاہے کرو۔صرف "میری بیوی" کے نام پر مجھے اعتراض ہوگا یہ انگریزی میں ٹھیک ہے لیکن اردو میں کچھ چھچھورا معلوم ہوتا ہے۔''[۶۶]

فیض صاحب نے اپنے خط میں جس تفریح کے سامان کی بات کی تھی وہ ایلس کو مہیا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں فیض صاحب سے اس کا ذکر کیا تو فیض صاحب نے انہیں واپسی خوشگوار موڈ میں لکھا:

''کلثوم کے بارے میں جو احوال تم نے لکھا ہے بہت پر لطف تھا۔ کچھ خفا، کچھ شک اور گمان تشہیر کے لیے اچھی چیز ہے اور یہ بھی اچھا ہے کہ ہماری آشنائی کسی کلثوم سے نہیں ہے۔ دور دور سے بھی نہیں ورنہ کوئی خاتون دل ہی دل میں ضرور اس کتاب کو اپنا لیتیں اور کہ ہم پہلی دفعہ کوئی پوشیدہ راز عشق ظاہر کر رہے ہیں اور کچھ تعجب نہیں کہ اس کتاب سے بے چاری کے دل کی کوئی شریان پھٹ جاتی۔''[۶۷]

مقدمے کے حوالے سے فیض صاحب ایلس کو لکھتے ہیں کہ مقدمے کا فیصلہ سنانے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ تم میں اتنی ہمت ہے کہ کل جو فیصلہ سامنے آئے گا تم حوصلہ مندی سے اس کو برداشت کرو گی۔ مقدمے کا فیصلہ فیض صاحب کے خلاف آتا ہے۔ پھر ایلس کو لکھتے ہیں کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ آخر جدائی کے یہ دن بھی ختم ہو جائیں گے۔ برصغیر میں برطانوی راج میں ایسا کوئی نہیں جس نے جیل نہ کاٹی ہو۔ وہ اپنی کتاب ''دست صبا'' اور ''نقش فریادی'' کے تراجم کے سلسلے میں وکٹر کیرنن کے لیے بھی مشورے دیتے ہیں۔ اپنی کتابوں کی پذیرائی پر خوشی کا محسوس کرتے ہیں۔ پھر انسانی فطرت کے بارے میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بنیادی طور پر سب انسان اچھے ہیں۔ چند لوگوں کو وہ برا سمجھتے ہیں۔ پھر وہ جیل کی میلی دیواریں، دھول مٹی، گرد غبار اور ہاتھوں میں جکڑی زنجیروں کے باوجود زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میں نے درخواست دی ہے کہ مجھے چند دنوں کے لیے کراچی بھیج دیا جائے تاکہ میں کسی ماہر ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کرا سکوں کیونکہ پہلے فیض صاحب کے کان میں انفیکشن کی وجہ سے درد تھا۔ اب یہ درد تو غائب ہو گیا اس کے ساتھ ہی دانتوں کی تکلیف شروع ہو گئی۔ پھر دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ پریشان ہونے کی

ضرورت نہیں میری صحت اچھی ہے۔کارڈیوگرام اور ایکس رے دونوں ٹھیک آئے ہیں۔صرف کان میں تکلیف ہے۔ابھی تک اس کا علاج ہو رہا ہے۔مزید ایلس کو لکھتے ہیں کہ بڑے صاحبوں سے زیادہ درخواستیں کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔جیل میں فیض کے مطالعے کی سرگرمیاں بھرپور طریقے سے جاری رہتی ہیں۔ان کا ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ نئی طرز پر تاریخ اردو شاعری تحریر کی جائے اس کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم نے فیض صاحب کو اسلامی تاریخ کا کا نیا تجزیہ لکھنے کی بھی آفر کی تھی۔تو فیض صاحب نے کہا تھا کہ زیادہ مناسب ہوگا اگر خلیفہ صاحب اس کے بارے میں کچھ اشارہ کر دیں لیکن بعد میں حکیم صاحب نے وہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔اس کے بعد کے خطوط میں فیض صاحب ایلس کو رہائی کے سلسلے میں بتاتے ہیں اور اس بارے میں کی جانے والی کاروائیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔فیض صاحب نے تین سال سے زائد کا عرصہ جیل میں گزارا تھا۔اس عرصے میں کئی موسموں کے اتار چڑھاؤ بھی دیکھے۔پھر فیض صاحب ۱۹ جون ۱۹۵۳ء میں ایلس کو لکھتے ہیں کہ میں کراچی کے لیے اپنا سامان باندھ رہا ہوں۔۸ خطوط کراچی جیل اور جناح ہسپتال کراچی سے تحریر کیے گئے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ماحول کی تبدیلی کو فیض صاحب پر اچھا اثر پڑا مگر وہ دوستوں سے ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔فیض صاحب اپنے صحت یاب ہونے کی اطلاع دیتے رہتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی بتاتے ہیں کہ جب وہ منٹگمری جیل جائیں گے تو ملاقات میں آسانی رہے گی۔پھر فیض صاحب نے ایلس کو ۲۳ اگست ۱۹۵۳ء کو لکھا کہ میرا آخری طبی معائنہ ہو گیا ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کی شاعری کا مجموعہ "دست صبا" کی اشاعت پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے رؤف ملک نے جیل کے دوران کی تھی۔اس کے علاوہ فیض کے ۳۵ خطوط منٹگمری (ساہیوال) جیل سے تحریر کیے گئے۔ان خطوط میں جیل کی طویل اور سخت احساس تنہائی کا بھی ذکر ملتا ہے۔۱۲ اکتوبر ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اخراجات کے لیے کچھ پیسے لیتی آنا۔پھر ۱۶ جنوری ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں ایلیان ایرن برگ کی کتاب storm کا بھی ذکر کرتے ہیں۔مطالعہ کے لیے اچھی کتاب ہے۔اسی خط میں شیکسپیئر کے ڈرامے رومیو اینڈ جولیٹ کی

ہیروئن کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں ایلس کو لکھتے ہیں کہ میں طبی معائنے کی غرض سے لاہور گیا تھا اور اب منٹگمری جیل واپس آنے کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ میں اپنے گھر واپس آ گیا ہوں۔ یہاں پر فیض صاحب نے جیل کے ماحول سے اپنائیت محسوس کی۔ ۲۳ مئی ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ان کے آنے سے پہلے بارک میں خان عبدالغفار خاں نظر بند رہے تھے۔ ان کا تعلق ادبی تحریکوں سے تھا اور خود کو مطالعے میں مصروف رکھتے تھے۔ وہ اپنے آس پاس مایوسی کو بھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے۔ فیض صاحب ۲۷ جولائی ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''صوفی صاحب سے کہنا کہ مجھے فیلن کی لغت تین چار ماہ کے لیے بھجوا دیں۔ آج کل میں ہومر کا ترجمہ کرنے کی فکر میں ہوں۔'' ۶۸

۱۱، اگست ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اس سال جیل میں سب سے زیادہ بے رونق عید تھی۔ نہ کوئی ملنے آیا، نہ کوئی یاد آیا۔ میں ڈان کو گزٹ پڑھتا رہا۔ ۲۵ اگست ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں فیض صاحب لکھتے ہیں کہ موسم ذرا بہتر ہوا ہے میں نے دوبارہ کام شروع کر دیا ہے۔ ابسن کے ڈرامے "Pillars of community" کا ترجمہ جاری رکھا ہوا ہے۔ آخر میں بیٹیوں کے نام آٹھ خطوط ہیں۔ جن میں ان کی تعلیمی سرگرمیوں، تفریحات اور ان کی مصروفیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کی یہ اہم کاوش ہے کہ جس طرح انہوں نے فیض صاحب کی ایام اسیری کے دوران لکھ گئے خطوط پیش کیے۔ اس کو جتنا بھی سراہا جائے اتنا کم ہے۔ فیض صاحب کے ایلس کو لکھے گئے خطوط ادبیات عالم میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی مدد سے فیض کی شاعری کو بہتر انداز میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ان خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ وہ ایک دردمند اور دکھ سکھ برداشت کرنے والے انسان ہیں۔ فیض صاحب کی شاعری کا بیشتر حصہ جیل خانے کی دیواروں کے پیچھے لکھا گیا ہے چنانچہ اس شاعری کے صحیح پس منظر کو سمجھنے کے لیے ان خطوط کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

راولپنڈی سازش کیس کا فیصلہ:

راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں تفصیلی جائزہ لیا ہے کہ فیض احمد فیض کے خلاف مقدمہ کی کیا بنیاد تھی اور فیض کا اکبر خاں اور جنجوعہ کیساتھ میل ملاپ کس نوعیت کا تھا۔فیض صاحب کا راولپنڈی جانا اور وہاں ۲۳ فروری والی میٹنگ میں حاضر ہونے کا کیا مقصد تھا۔ یہ سب کچھ اسی مضمون ''راولپنڈی سازش کیس'' میں بیان کیا ہے۔

آخر میں ایوب مرزا فیض کے نام جو دستاویز X.Pw.۳/۱۵ میں درج ہے ان کا ذکر کرتے ہیں ۔ان دستاویز سے یہ تصدیق بھی ہوگئی ہے کہ یہ دستاویز اکبر خان کے قبضہ سے حاصل کئے گئے ہیں اور بہت سارے گواہوں نے فیض کی شناخت کی ہے۔اس مقدمہ کی پہلی شناختی پریڈ سنٹرل جیل لائلپور میں مجسٹریٹ درجہ اول محمد بشیر نے کرائی تھی (PW،۱۵۲) تین گواہوں نے اس ٹیسٹ میں حصہ لیا تھا ۔ان میں ایک چپڑاسی (PW،۱۶۱) جان محمد ڈرائیور (PW،۲۴) اور امیر شاہ (PW،۳۳) شامل تھے۔ان تینوں گواہوں نے صحیح طور پر فیض کی نشاندہی بھی کی تھی،اور یہ بات بھی درست ہے کہ فیض کو جن لوگوں میں شامل کیا گیا تھا،وہ بالکل دوسرے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔شناختی ٹیسٹ کی اہمیت ان گواہوں کی شہادتوں میں تصدیق کرنا ہوتا ہے۔جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے ملزم کو کسی خاص موقعہ پر دیکھا تھا ۔اس پریڈ ہر ایک گواہ کو شناخت کرنے کا اچھا موقع تھا۔آخر میں سوال یہ ہے کہ ان تینوں گواہوں کے بیانات قابل اعتبار بھی ہیں کہ نہیں،لیکن مجسٹریٹ نے یہ نوٹ لکھا:

> ''جیل کے اندر میں نے خود گھوم پھر کر ان لوگوں کو چنا ہے جو زیادہ سے زیادہ فیض احمد فیض کے حلیے سے مشابہت رکھتے تھے۔لیکن مجھے جیل میں ایسا شخص نہیں ملا جو داڑھی مونڈتا ہو۔''[۶۹]

ان تمام واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض کے خلاف یہ ایک مکمل سازش تھی اور ان پر یہ الزام حتمی طور پر قائم کیا گیا تھا۔

فیض کی رہائی:

راولپنڈی سازش کیس میں ۵ جنوری ۱۹۵۳ء کو فیض صاحب کے مقدمے کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ ان کے خلاف تھا انہیں مزید ڈھائی سال کی سزا سنائی گئی۔ حالانکہ فیض صاحب اس سے پہلے بھی کافی سزا کاٹ چکے تھے۔ ابھی ان کی سزا کے ڈھائی سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد نے اپنے سیاسی مفادات کی خاطر پاکستان کی دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔ محمد علی بوگرہ پاکستان کے پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ اسمبلی ٹوٹ جانے کے بعد راولپنڈی سازش کیس اسپیشل ٹریبونل کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ ملک غلام محمد نے جو دستور ساز اسمبلی توڑی تھی اسی اسمبلی نے لیاقت علی خان کے دور میں اسپیشل ٹریبونل کے قیام کو عمل میں لایا تھا۔ حسین شہید سہروردی فیض صاحب کے کیس کی پیروی کر رہے تھے۔ اسی لیے ماہرین قانون نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راولپنڈی سازش کیس کے قیدیوں کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔ جس کے نتیجے میں ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو فیض صاحب اور ان کے ساتھیوں کی رہائی عمل میں آئی جبکہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے لکھا ہے

''عدالت نے اسے کالعدم Non effective قرار دیتے ہوئے ہوئے

تمام اسیران راولپنڈی سازش کیس کو بری کر دیا۔''[۷۰]

ڈاکٹر صلاح الدین حیدر نے اپنی کتاب "فیض احمد فیض شخصیت و فن" فیض صاحب کی رہائی کی تاریخ ۲۰ اپریل بتائی ہے۔ یوں انہوں نے اپنی زندگی کے چار سال ایک ماہ اور گیارہ دن جیل میں گزارے۔

ماسکو اور لندن کا سفر اور واپسی پر جیل:

۱۹۵۵ء میں فیض صاحب جیل سے رہا ہو کر پاکستان ٹائمز میں واپس آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی امروز اور لیل و نہار کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی دوران فیض صاحب صحافیوں کے ایک وفد کے ہمراہ چین کے دورے پر گئے۔ پاکستان کے وزیراعظم حسین شہید سہروردی چین کے دورے کا پروگرام بنایا۔ صحافیوں کا یہ وفد جب چین کی سرزمین پر اترا تو چینی مہمانوں نے انہیں اطلاع دی کہ پاکستان کے وزیراعظم نے چین کا دورہ منسوخ کر دیا ہے۔ اس وفد کا چین کی حکومت کی بجائے چین کی جرنلسٹس یونین کے مہمان کے طور پر استقبال کیا گیا۔ فیض صاحب کی دو نظمیں ''پیکنگ'' اور ''سنکیانگ'' اسی سفر کی یادگار نظمیں ہیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۷ ستمبر ۱۹۵۵ء کو سکندر مرزا نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ چودھری محمد علی کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ دے دیا جبکہ عوامی لیگ کے قائد حسین شہید سہروردی نے اس اپنا حق تلفی سمجھا۔ انہیں وجوہ کی بنا پر وہ چین نہیں جا سکے ہوں گے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ہمیں پوری معلومات نہیں دیں۔ ملک کی سیاسی صورت حال دن بہ دن زیادہ گھمبیر اور خراب ہوتی جا رہی تھی۔ جنرل سکندر مرزا جن کو فوج کی مکمل حمایت حاصل تھی ملک کے بادشاہ بنے بیٹھے تھے۔ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو توڑ کر ایک واحد صوبہ بنا دیا گیا۔ سندھ اور سرحد کی صوبائی اسمبلیوں نے اس کی بھرپور مخالفت کی لیکن ان کی کسی نے نہیں سنی۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان کو اکثریتی صوبہ ہونے کی بنا پر قومی اسمبلی میں جو اکثریت حاصل تھی اس کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مشرقی بنگال میں ہنگامہ آرائی ہوئی تو صوبائی وزارت کو ختم کر کے وہاں گورنر راج قائم کر دیا۔ مغربی پاکستان میں سکندر مرزا اور مشتاق احمد گورمانی کے کہنے پر راتوں رات ''ری پبلکن پارٹی'' کے نام سے ایک نئی پارٹی بنالی گئی اور صوبائی اسمبلی کے کافی سارے مسلم لیگی ارکان اس نئی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ تب نیا آئین بنا اور سکندر مرزا جو حکومت برطانیہ کر نمک خوار تھے۔ جن کا تحریک پاکستان یا پاکستان کی تشکیل

سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ پاکستان کے پہلے صدر بن بیٹھے اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۷ء کو یوم پاکستان کا جشن سرکاری طور شان و شوکت سے منایا گیا۔ ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء کے یہ دو سال فیض صاحب پر بہت بھاری ثابت ہوئے وہ بظاہر تو پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر تو تھے۔ مگر ان کے ذمے اخبار کا کوئی کام نہ تھا۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ پاکستان ٹائمز کی چیف ایڈیٹری چھوڑ دوں۔ یوں انہوں نے مئی ۱۹۵۸ء پروگریسیو پیپرز کی چیف ایڈیٹری کو خیر باد کہہ دیا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جنرل ایوب خان نے سکندر مرزا کو معطل کر دیا۔ ملک میں مارشل لا نافذ کر کے خود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گیا ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے یہاں جو تاریخ بتائی ہے وہ درست نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سبط حسن لکھتے ہیں کہ ۷ اور ۸ کی درمیانی شب میں جنرل ایوب خان نے اقتدار پر حملہ کیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا، آئین ختم کر دیا گیا، وزارتیں اور اسمبلیاں بھی توڑ دی گئیں یہاں تک کہ اخباروں پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ فیض صاحب ان دنوں ماسکو میں تھے۔ وہ اور حفیظ جالندھری ایفرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم کی افتتاحی تقریبات میں شرکت کی غرض سے سوویت یونین گئے ہوئے تھے۔ پاکستان میں مارشل لاء لگنے کی خبر ان تک بھی پہنچ چکی تھی۔ انہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ فوج کی اقتدار میں آنے کی خبریں کئی مہینے سے گردش کر رہی تھیں جبکہ فیض صاحب پاکستان لوٹنے کے لیے بے قرار تھے اور انہیں یقین تھا کہ جاتے ہی جیل بھیج دیے جائیں گے۔ ۱۹۵۸ء کی تاشقند کی ایفرو ایشیائی کانفرنس کے موقع پر الیگزانڈر سرکوف نے فیض صاحب سے سوال کیا کہ مستقبل قریب میں ان کا کیا ارادہ ہے۔ تو فیض صاحب نے بتایا:

> ''بس پہلے تو میں لندن جاؤں گا، وہاں اپنے بعض دوستوں سے ملوں گا جو ابھی ابھی پاکستان سے آئے ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ میں کراچی، لاہور اپنے وطن واپس جاؤں گا۔''[۱۷]

وطن واپسی کی صورت میں جیل جانے کے امکان پر ایک سوال کے جواب میں فیض صاحب نے کہا:

''اگر جیل سے بھی کوئی بدتر چیز ہے تو پھر وطن کی خاطر، ملک کے ان جیالوں کی

خاطر جن کی پگ دھجیاں ہو جاتی ہیں، مجھے وہ بھی قبول ہے۔''۲۷

فیض صاحب ایک نڈر، بیباک اور جرات مند انسان بھی تھے۔ وہ اپنی جان کی قربانی تو دے سکتے تھے مگر وطن سے دوری انہیں برداشت نہیں تھی۔ فیض صاحب کو لندن میں بھی کچھ دوستوں نے ان کو مشورہ دیا کہ ان حالات میں وطن واپس نہ جائیں چنانچہ فیض صاحب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ وطن واپس جائیں گے سو وہ واپس آ گئے۔

وطن واپسی کے بعد فیض صاحب دسمبر ۱۹۵۸ء میں گرفتار ہوئے اور اپریل ۱۹۵۹ء میں رہا ہوئے۔ اس دوران تفشیش کے لیے انہیں شاہی قلعہ لاہور لے جایا گیا۔ فیض صاحب نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا کہ قید کے دوران ان پر کس طرح کا دباؤ ڈالا جاتا رہا مگر سبط حسن لکھتے ہیں کہ ویسے تو فیض صاحب لائل پور جیل میں بھی تنہا رہ چکے تھے وہاں پر ان کے مشقتی شمس الدین جوان کے لیے کھانا بناتے تھے اور ان کا دل بہلانے کے لیے نوابوں، جنوں اور بھوتوں کے قصے سنایا کرتے تھے لیکن شاہی قلعہ کے آداب زنداں بالکل مختلف تھے۔ یہاں قیدیوں کو پوچھ گچھ کے لیے لے جایا جاتا ہے اور وہ پولیس کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ جیل خانہ تو فیض صاحب کے لیے دوسرا گھر بنتا جا رہا تھا ادھر کوئی بات ہوتی ادھر فیض صاحب کو جیل بلا لیا ہوتا۔

جن دنوں فیض صاحب شاہی قلعہ میں قید تھے تو جنرل ایوب خان نے حکم جاری کیا کہ سب وزرا اور سرکاری افسر اور صاحب دولت اپنے اپنے اثاثوں کا گوشوارہ جمع کروائیں۔ اہل ثروت و اقتدار نے اس اعلان پر جس دیانت داری کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر کرنا تو بے کار ہے۔ فیض صاحب نے قلعے میں بیٹھ کر اس موضوع پر لکھا:

ہم خستہ تنوں سے محتسبو، کیا مال منال کا پوچھتے ہو

جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں

فیض صاحب نے تو کبھی کچھ بچا کے نہیں رکھا تھا۔ان کو تو بلا ضرورت جیل بلا لیا جاتا تھا۔

پاکستان ٹائمز میں ملازمت کی پیش کش:

فیض صاحب جیل سے رہا ہوئے تو اصل مسئلہ روزگار کا تھا۔پہلی بار جب جیل گئے تھے تو پاکستان ٹائمز کا ادارہ سلامت تھا۔اب جو جیل سے باہر آئے پاکستان ٹائمز تو تھا مارشل لاء کی حکومت نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ایسے حالات میں وہ اخبار کی ادارت کیسے سنبھالتے۔نئی حکومت نے ان کو چکر میں پھنسانے کی کوشش کی۔اس کے متعلق ڈاکٹر ایوب مرزا نے بیان کیا ہے۔

> ''جیل سے رہائی کے تیسرے دن میرے ملازم نے بتایا کہ جناب پولیس کی گاڑی آئی ہے۔میں نے کہا پھر آ گئے۔دیکھا کہ نذیر رضوی ہیں۔پوچھا کیا بات ہے؟وہ کہنے لگے کہ میں آئی جی،سی آئی ڈی،کی حیثیت سے یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ تمہارے دوست کی حیثیت سے آیا ہوں۔میں نے کہا بہت اچھی بات ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے؟نذیر رضوی کہنے لگا جو اخبار سرکار نے لے لیا ہے آپ اس کے چیف ایڈیٹر بن جائیں۔میں نے کہا"بھاگ جاؤ۔''[۳۷]

فیض صاحب نے اصولوں کی خاطر کبھی سودے بازی نہیں کی۔حالانکہ انہیں روزگار کی ضرورت تو تھی اور اس ضرورت کے وقت بھی اس ظاہری چمک دمک والی نوکری کی طرف نہیں دیکھا۔فیض صاحب بڑے حوصلے والے تھے اور اس کا مظاہرہ بھی کر دکھایا کہ وہ ایک حوصلہ مند انسان ہیں۔

لینن امن انعام:

۱۹۶۲ء میں فیض صاحب کو لینن امن انعام سے نوازا گیا یہ وہ سنہری لمحہ تھا جب انہیں سوویت یونین کی طرف سے لینن امن انعام ملا کیونکہ یہ انعام فیض صاحب کی مجموعی خدمات کے پیش نظر دیا گیا۔ جس میں ان کی ادبی خدمات، زنداں میں برداشت کی گئی سختیاں، مزدور یونین میں عملی طور سے شرکت، فاشزم کے خلاف جنگ میں عملی حصہ اور عالمی امن تحریک کے فروغ میں ان کی جدوجہد اور دیگر سماجی اور سیاسی خدمات بھی شامل تھیں۔ ۱۹۶۲ء میں فیض صاحب لینن امن انعام لینے کے لیے اپنی بیٹی سلیمہ کے ساتھ بحری جہاز سے روانہ ہوئے کیونکہ دل کی تکلیف کے باعث وہ ہوائی جہاز سے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ راستے میں سی آئی ڈی والوں نے کاغذات کی جانچ پڑتال کے لیے فیض صاحب کو بار بار تنگ کیا لیکن فیض صاحب نے برداشت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ بین الاقوامی لینن امن انعام کی تقریب میں فیض صاحب نے تقریر بھی کی:

> ''یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے۔ جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوشمند انسانوں میں اختلاف کی

گنجائش نہیں ہونی چاہیے لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے۔'' ۴ے

پھر اس کے بعد فیض صاحب نے دنیا میں خیر اور شر کی قوتوں کے مسلسل متحارب ہونے کی وجوہات بیان کیں اور افریقہ اور ایشیا میں نو آزاد ممالک کے آپس کے اختلافات کا بھی ذکر کیا۔ اپنے ملک پاکستان اور ہمسایہ ملک بھارت کے اختلافات کا بھی ذکر کیا۔

لندن میں قیام:

ماسکو میں لینن امن انعام لینے کے بعد فیض صاحب نے لندن میں قیام کا منصوبہ بنایا۔ لندن میں ان کا قیام ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۴ء تک ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ اسی دوران ناٹنگھم میں فیض صاحب کے اعزاز میں جلسہ منعقد ہوا اور ان کو کیوبا، الجزائر، مصر اور عراق سے بھی دعوت نامے موصول ہوئے اور ان ملکوں میں فیض صاحب کی بہت عزت افزائی ہوئی۔ فیض صاحب نے لندن میں اپنا مکان خرید لیا تھا ایلس بھی چھوٹی بیٹی کو لے کر لندن چلی گئیں ایک پر سکون زندگی بسر کرنے لگے۔ فیض صاحب ڈیڑھ سال کے بعد بھی لندن کی فضا سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ لندن میں انہوں نے بی بی سی کی اردو نشریات میں صلائے عام کے کئی پروگراموں بھی حصہ لیا۔ ان پروگراموں میں زیادہ تر یک موضوعی تقریر، انٹرویو منعقد ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے فیض صاحب نے بتایا کہ وہ واپس جانا چاہتے ہیں:

> ''یہ کوئی ملک ہے جس کا کوئی چاند نہیں، جہاں ستارے نہیں ہوتے، جس کا کوئی
> سورج نہیں ہے۔ سورج چاند ستاروں کے بغیر ہمارے نزدیک زندگی کا تصور موجود
> نہیں ہے۔'' ۵ے

فیض صاحب لندن میں خوش نہیں تھے۔ وہ واپس جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہیں وطن کی ایک ایک چیز کی یاد

ستاتی ہے اور بھلا لندن میں کون ہے جس سے وہ باتیں کریں اور شعر سنائیں۔ فیض صاحب نے لندن میں اپنا ایک ذاتی مکان بھی خرید لیا تھا جو بعد میں انہوں نے فروخت کر لیا تھا۔ خالد حسن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ فیض صاحب لندن جب بھی آتے تھے اپنے دوست افضل کے گھر قیام کرتے تھے۔ جن کی فیض صاحب سے کافی پرانی دوستی تھی۔

کراچی میں قیام:

لندن سے واپس آنے کے بعد فیض صاحب نے ۱۹۶۴ء سے عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل اور نگران کی حیثیت سے فرائض سرانجام دینا شروع کر دیے۔ فیض صاحب اپنی معمول کی ذمہ داریوں کے علاوہ ڈان اخبار میں کالم بھی لکھنے لگے۔ کراچی میں فیض صاحب کا حلقہ احباب بھی کافی وسیع تھا۔ فیض صاحب نے جب اس کالج کے انتظامی امور سنبھالے تو اس کالج نے پورے کراچی کے تعلیمی اداروں میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس کالج کو فیض صاحب کی شخصیت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ سبط حسن لکھتے ہیں:

> ''جس وقت فیض صاحب کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو کالج پر نزع کا عالم طاری تھا۔ ٹوٹی پھوٹی عمارت، بے سروسامان کمرے۔''[۶]

فیض صاحب اپنی کوششوں سے اس کالج کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس کالج نے کراچی کے تعلیمی اداروں میں اپنی شناخت بنالی تھی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اسی کالج کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ایک مرتبہ ان کے کالج کے طلبا نے ایوب خان کے خلاف جلوس نکالنے کی ٹھانی۔ پولیس کا خبر ہوئی تو بھاری مقدار میں مسلح پولیس نفری نے کالج کو محاصرے میں لے لیا۔ فیض صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے پولیس افسران اور انتظامیہ سے رابطہ کیا اور کہا کہ پولیس کا کسی بھی

دوسگاہ کے باہر جمع ہونا طلبا کو اشتعال پر اکسانے کے لیے کافی ہے۔''۷۷ے

مزید فیض صاحب نے کہا کہ پولیس ہٹالی جائے۔فیض صاحب نے طلبا سے خطاب کیا کہ اگر آپ جلوس کی صورت میں احتجاج کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کریں مگر سرکاری املاک کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔طلبا نے جلوس نکالا،احتجاج کیا اور بغیر کسی نقصان کے واپس آ گئے۔عبداللہ ہارون کالج میں درس و تدریس کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک فیض صاحب کراچی میں قیام پذیر رہے۔اس کے علاوہ فیض صاحب کی ''سرِوادی سینا'' کی شاعری بھی ان کے کراچی کے قیام کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

فیض اور پاک بھارت جنگ:

فیض صاحب بنیادی طور پر امن انسان تھے اور انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی نظریے کے تحت گزار دی۔بعض اوقات قومی زندگی میں ایسے موڑ بھی آتے ہیں جہاں انسانوں کو اپنے نظریے کی قربانی دینی پڑتی ہے۔جب دوسری عالمی جنگ میں فاشزم کے خلاف جنگ کا وقت آیا تو فیض صاحب عملی طور پر اس جنگ میں کود پڑے۔پاکستان کی قومی تاریخ میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کا وقت آیا تو لوگوں نے فیض صاحب کی طرف دیکھا۔ایسی ہی صورت حال میں فیض صاحب کو سرکار نے کراچی سے راولپنڈی بلایا۔ابھی جنگ اپنے عروج پر تھی کہ بلیک آؤٹ کے زمانے میں فیض صاحب کی ملاقات ڈاکٹر ایوب مرزا سے ہوئی اور انہوں نے فیض صاحب سے راولپنڈی میں ان کی موجودگی کا سبب پوچھا تو فیض صاحب نے بتایا:

> ''بھئی معاملہ کچھ یوں ہے کہ حکومت نے ہمارے ساتھ رابطہ قائم کیا اور کہا کہ انہیں جنگ میں پبلسٹی محاذ پر ہماری ضرورت ہے وہ ہمارے تجربے اور مشورے سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ہم نے کہا ٹھیک ہے۔اگر ہمارے مشورے سننے کی خواہش ہے تو ہم حاضر ہیں۔ان پر

عمل کرنا یا نہ کرنا سرکار کی اپنی مرضی پر ہے۔مگر مشورے ہم اپنی مرضی سے دیں گے۔انہوں

نے تنخواہ کا پوچھا۔ہم نے کہا اس قومی فریضہ کی زکواۃ ہمیں نہیں چاہیے۔صرف رہائش اور

خوراک کے سرکاری بندوبست پر احتجاج نہیں کیا۔''۸؎

جنگ ایک بری چیز ہے کیونکہ اس کے اثرات بڑے دوررس ہوتے ہیں۔فیض صاحب جنگ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ جنگ کا طریقہ کار کیا ہوگا اور یہ کس مقام پر ختم ہوگی۔مزید فیض صاحب بتاتے ہیں:

'' بھئی ہماری رائے پہلے دن سے یہی ہے کہ دونوں ملکوں کے حالات کے پیش

نظر جنگ زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔سترہ،اٹھارہ دن کے بعد جنگ بندی ہوجائے

گی۔''۹؎

مگر حکومت ہماری بات کو تسلیم نہیں کرتی اور وہ عوام کے جذبہ جنگ کو مسلسل بلند کرتی جارہی ہے۔ہم نے مشورہ دیا کہ اسے اتنا اوپر نہ لے جاؤ پھر نیچے اتارنا مشکل ہوجائے۔فیض صاحب نے جنگ کے دوران سپاہی کا مرثیہ بھی لکھا۔جس نے محاذ پر وطن کے دفاع اور سلامتی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کیا۔

سپاہی کا مرثیہ:

اٹھو اب ماٹی سے اٹھو

جاگو میرے لال،

اب جاگو میرے لال

تمری سیج سجاون کا رن

دیکھو آئی رین اندھیارن

نیلے شال دوشالے لیکر

یہ گیت نما نظم انہوں نے جنگ کے خاتمے پر لکھی تھی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لکھا گیا ان کا یہ گیت تو ایک شاہکار ہے۔

ماسکو میں ادیبوں کی کانفرنس:

مئی ۱۹۶۷ء میں سوویت یونین ماسکو میں ادیبوں کی چوتھی کانفرنس یا کانگریس کا انعقاد ہوا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان سے فیض احمد فیض اور بھارت سے کرشن چندر کو دعوت نامہ بھیجا گیا۔ دونوں ممالک کے ادیبوں ،شاعروں اور دانشوروں کا آپس میں رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ فیض صاحب کی خواہش تھی کہ دونوں ممالک کے درمیان روابط بحال ہوں۔ کانگریس کی صدارت فیدن نے کی۔ اس کے باقی اراکین میں شولوخوف، مرزا ابراہیم کربایاف اور دیگر یورپی اور ایشیائی سوویت ریاستوں کے مشہور نمائندے شامل تھے۔ کانگریس کے ابتدائی اجلاس میں روسی حکومت کے صدر، روسی کابینہ اور وزیر اعظم بھی شامل تھے ان کو ادیبوں کے پریزیڈیم کے پیچھے بٹھایا گیا تھا۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ اس زمانے میں ادیبوں کو خاص عزت دی جاتی تھی۔

فیض صاحب اور کرشن چندر کو ہوٹل مسکوا میں ایسے ٹھہرایا گیا جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ ہوں۔ پہلی شام کے کھانے کا انتظام اسی ہوٹل میں کیا گیا تھا لیکن ان دونوں میں فاصلہ اتنا تھا کہ ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے فیض صاحب نے کہا کہ یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ بھی متعصب سیاستدانوں کی طرح ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ادب میں یہ دشمنی نہیں چلتی۔ بقول فیض:

''مگر اس بدقسمتی کو کیا کہیے کہ تمہاری میری ملاقات اب نہ ہندوستان میں ہوتی ہے

نہ پاکستان میں اور ہوتی ہے تو صرف ماسکو میں۔''[۸۰]

ان لوگوں کو چاہیے کہ ہر سال روسی ادیبوں کی ایک کانگریس منعقد کر لیا کریں تا کہ فیض صاحب اور کرشن چندر آپس میں مل لیا کریں۔ آخر کار جدائی کا لمحہ بھی آ پہنچا۔ فیض صاحب کو وی آنا کے لیے روانہ ہونا تھا اور کرشن چندر اور سلمیٰ کو آذربائجان جانا تھا۔ فیض صاحب نے کاغذ کے دو پرزے نکال کر کرشن چندر کو دیئے اور کہا کہ یہ دونوں نظمیں کہیں نہیں چھپی ہیں۔ میں نے ماسکو میں کہی ہیں۔ فیض صاحب نے کرشن چندر کو گلے ملے اور کہا کہ یہ جدائی عارضی ہے ہم پھر ملیں گے۔ اس پر کرشن چندر نے کہا کہ چوبیس برس کی سخت نفرت اور جنگ و جدل کے باوجود ہمارے دلوں میں جو محبت بھری ہوئی ہے وہ ختم نہیں ہو سکتی۔

پاکستان میں دوسرا مارشل لاء:

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ایوب خان کے اقتدار کو زوال شروع ہو گیا تھا۔ پورے ملک میں عوامی احتجاج نے زور پکڑ لیا تھا لیکن اس عوامی احتجاج کا فائدہ کسی اور کو پہنچا۔ وہ یحیٰ خان کے لگائے ہوئے مارشل لاء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ فیض صاحب نے ایوب خان کی تنزلی کے بارے میں غزل کے قدیم اور روایتی انداز میں خوب صورت طریقے سے اس کا اظہار کیا ہے۔

اب بزم سخن صحبت لب سوختگاں ہے
اب حلقہء مے طائفہ بے طلباں ہے
گھر رہیے تو ویرانی دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

پیوند رہ کوچہ زر چشم غزالاں

پابوس ہوس افسر سمشاد قداں

اب صاحب انصاف ہے خود طالب انصاف

مہر اس کی ہے میزان بہ دست دگراں ہے

مہر ایوب خان کی اور میزان یحیٰ خان کا ایک بار پھر مارشل لاء لگ گیا۔ ملک پر سیاہ بادل چھا گئے۔ فیض صاحب نے اس موقع پر بہت کچھ لکھا

خورشید محشر کی لو

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

دور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن

فیض اور سقوط مشرقی پاکستان:

مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن اور سول وار میں بے گناہ انسانوں کے قتل عام پر فیض صاحب سے برداشت نہیں ہوا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان میں ہونے والے المناک واقعات کے پس منظر میں فیض صاحب کا احتجاجی کلام بھی شامل ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے مظلوم عوام سے اپنے ہمدردانہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس عزم کا پختہ اعادہ کیا ہے۔ جہاں ظلم ہو تو اس کے خلاف آواز اٹھاؤ۔ عام لوگوں پر ظلم کی کوئی بھی قسم ہو وہ انسانی مصیبتوں میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔ فیض صاحب ظلم کو روکنے کے لیے، جو معاشرے کی نشوونما کے لیے سم قاتل ہے۔ شاعری کے ذریعے اپنی آواز بلند کی اور اسی لمحے فیض پکار اٹھے:

حذر کرو مرے تن سے

سجے تو کیسے سجے قتل عام کا میلہ

کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا

مرے نزار بدن میں لہو ہی کتنا ہے

چراغ ہو کوئی روشن نہ کوئی جام بھرے

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے اس نظم کے بارے میں بتایا:

''یہ نظم میں نے مارچ ۱۹۷۱ء میں کہی تھی۔ مشرقی پاکستان میں نفرت کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔ جو کل تک دوست آشنا تھے وہ اغیار ہو چکے تھے۔ جو کل تک آپس میں بھائی تھے وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے اور یحیٰ خان نے اپنی مخصوص فراست سے کام لیتے ہوئے ادھر ملٹری ایکشن شروع کر دیا تھا۔ ان حالات اور واقعات کو روکنے کے لیے جس حقیقی قوت کی ضرورت تھی وہ ایک منظم متحد اور بالغ نظر سوشلسٹ تحریک تھی۔''[۸۱]

مشرقی پاکستان کے کسانوں، مزدوروں سے مغربی پاکستان کے مزارعوں، مزدوروں کا جو درد کا رشتہ تھا اسے حاکموں نے نفرت میں بدل دیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے وہ واقعات اور حالات ایسے ہیں جنھوں نے میرا دل زخمی کر دیا تھا۔ مجھے زندگی میں اس سے بڑھ کر کسی واقعہ سے صدمہ نہیں ہوا۔ مشرقی پاکستان میں قتل و خون کی جو ہولی کھیلی گئی سروادی سینا کی بیشتر شاعری اس کے گرد گھومتی ہے۔ سروادی سینا میں دو اہم موضوع ملتے ہیں ایک ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ سے متعلق ہے اور دوسری مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن کے بارے میں لکھی گئی ان کی احتجاجی نظمیں ہیں۔

فیض صاحب کے دل سے بھی خون کا ایک سیلاب امڈ آیا اور اپنے چکنا چور ہونے والے خوابوں کو ایک بار پھر سے اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سقوط ڈھاکہ کی خبر پاکستان کے گلی محلے میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ یہ ایک ایسی آگ تھی جس نے ہر کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب فلیش مین ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے انہوں نے ایوب مرزا کو بلایا:

''کمرے میں سناٹا تھا۔ بتیاں گل تھیں اور پردے یوں لٹک رہے تھے جیسے کسی
ہارے ہوئے جواری کا منہ۔ صوفے خالی پڑے تھے اور میز پر نہ جام نہ سبو۔۔۔
باہر آ کر دوبارہ کمرے کا نمبر دیکھا۔ کمرہ وہی تھا۔''۸۲

پھر فیض صاحب نے بتایا کہ سقوط مشرقی پاکستان مکمل ہو چکا ہے۔ کہنے لگے کہ ہر تخریب میں تعمیر کا پہلو ضرور ہوتا ہے لیکن اگر آپ اپنے گھر کو خود تباہ کر دیں تو تکلیف تو ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ انہی دنوں المیہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے فیض صاحب کا ایک اخباری بیان بھی شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے پوچھا گیا تھا کہ آپ نے بھارت اور روس کے اقدامات کے خلاف جو بیان اخبارات کو دیا ہے وہ کس جذبے یا دباؤ کے تحت دیا گیا ہے۔ کہنے لگے:

''بھئی دباؤ وباؤ ہم نہیں مانتے اور نہ ہم پر کوئی دباؤ تھا۔ البتہ میرے ذہن پر اس
المیہ کا بوجھ تھا۔ جذبہ جو اس بیان میں کارفرما ہے وہ تو میرے وطن کی سلامتی کا جذبہ
ہے۔ بھئی اس معاملے میں بھارت اور روس دونوں کی روش وہ نہیں تھی جس کا علم
لے کر لینن نکلا تھا اور پھر ہم کوئی روس کے ملازم تو نہیں۔''۸۳

اگر وہ غلط کام کریں تو ہم اسے ٹھیک تو نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے لیے سب سے اہم ہمارا ملک ہے۔ ملک کا صحیح تحفظ ملک کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کو صرف اور صرف عوامی طاقتیں ہی محفوظ کر سکتی ہیں۔

فیض اور محکمہ کلچر وثقافت:

المیہ مشرقی پاکستان کے بعد فیض صاحب نے تہذیب وثقافت کے حوالے سے اپنی توانائیوں کا بھرپور استعمال کیا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد فیض صاحب ملک سے باہر جانا چاہتے تھے مگر بھٹو صاحب کی کابینہ کے ایک سینیئر وزیر جے اے رحیم نے ان کی ملاقات پاکستان کے اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے کرائی انہوں نے فیض صاحب سے کہا کہ آپ ملک سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہاں پر آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ باقی معاملات جے اے رحیم سے طے ہو گئے تھے۔ اپنی ملاقات میں فیض صاحب نے اس رپورٹ کا بھی ذکر کیا جو ایوب خان کے دور میں مرتب ہوئی تھی لیکن اس وقت کی حکومت نے اسے دبا دیا تھا۔ ثقافت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس کا آغاز ۱۹۷۲ء میں ہو چکا تھا اور اس کا خواب ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آخر میں دیکھا گیا اس حوالے سے احمد سلیم لکھتے ہیں کہ ۱۱ مئی ۱۹۶۸ء کو مشرقی مغربی پاکستان کے ۲۰ ارباب ثقافت اور وزارت تعلیم کی اسلام آباد میں میٹنگ ہوئی۔ جن میں فیض صاحب کے علاوہ نعیم طاہر، زبیدہ آغا، ریاض انور، عرفان حسین، سید امتیاز علی تاج، یونس سعید، بانو قدسیہ، قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی مغربی پاکستان سے آئے اور اے آر چوہدری، صلاح الدین محمد، بیگم رقیہ کبیر اور محمد نورالہدیٰ شاہ مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ ان لوگوں نے فیض احمد فیض کی رہنمائی میں ایک چھ رکنی سٹینڈنگ کمیٹی بنائی۔ فیض کے دوسرے ساتھیوں میں ڈھاکہ سے پروفیسر منیر چوہدری، بیگم رقیہ کبیر اور اصلاح الدین محمد، لاہور سے بانو قدسیہ اور کراچی سے جمیل الدین عالی بھی شامل تھے۔ کمیٹی نے دو نکاتی ایجنڈے میں ملک کے مختلف علاقوں میں سرکاری امداد سے چلنے والی ثقافتی تنظیموں کا قیام ممکن بنایا جائے جو ملک بھر میں ہونے والی ثقافتی سرگرمیوں کو منظم کرنے کے ساتھ ساتھ فن اور ثقافت کی ترویج وترقی کے سلسلے میں رہنمائی کرے۔

بقول احمد سلیم:

''سٹینڈنگ کمیٹی جو بعد میں فیض کلچر کمیٹی کے طور پر مشہور ہوئی نے کراچی، لاہور،

حیدر آباد، ملتان، ڈھاکہ، چٹاگانگ، کھلنا، راجشاہی، پشاور اور راولپنڈی میں کم و

بیش چوہتر اجلاس منعقد کیے، فن و ثقافت سے متعلق تین سو شخصیات کے انٹرویو کیے

اور ملک بھر کی تینتیس ثقافتی تنظیموں کے نمائندے سے ملاقاتیں کیں۔''۸۴

اب فیض صاحب کے کہنے پر اس فائل کو دوبارہ کھولا گیا اور اس کی روشنی میں فیض صاحب کو کلچر اور ثقافت کا انچارج مقرر کیا گیا۔ فیض صاحب نے اس آفر کو خوشی خوشی قبول کیا اور انہوں نے دل چسپی کے ساتھ پاکستانی ثقافت کے خدوخال کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اب اصل مسئلہ تو دفتر اور عملہ کا تھا۔ فیض صاحب نے جے اے رحیم کے ساتھ مل کر اسلام آباد میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا۔ فیض صاحب نے دفتر کھولنے اور بند کرنے کے لیے عطا صاحب کی خدمات حاصل کر لیں جو ریڈیو پاکستان میں میں اکاؤنٹینٹ تھے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ادارے کا نام رکھنے پر کافی بحث ہوئی۔ اس کا نام ''پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس'' رکھا گیا۔ اس پر ایلس بولی کہ اسے انگریزی میں ''پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس'' کہنا چاہیے۔ قدرت اللہ فاطمی صاحب نے ''دی'' پر اعتراض کیا۔ اس پر فیض صاحب نے کہا کہ انگیریزی میں ''دی'' ضروری ہوتا ہے۔ پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کی بنیاد تو رکھی جا چکی تھی اور فیض صاحب اس کے پہلے چیئرمین بنے۔ بعد میں جب اس ادارے کو پارلیمنٹ کی منظوری ملی تو انہیں اس ادارے کا مشیر مقرر کیا گیا۔

فیض صاحب اس ادارے کے ساتھ ہی کچھ اور اداروں کا قیام بھی ممکن بنانا چاہتے تھے۔ لوک ورثے کی حفاظت اور اس کو ترقی دینے کے لیے ایک اور ادارہ بھی بنوایا جسے لوک ورثے کا میوزیم کہا جاتا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے پرانی اشیا جمع ہونے لگیں اس کام میں ایلس بھی ان کے شانہ بشانہ کام کر رہی تھی۔ فیض صاحب نے ادیبوں اور

شاعروں کے لیے اکیڈمی آف لیٹرز کے قیام کی تجویز کو بھی آگے بڑھایا اور اب یہ سارے ادارے اپنی اپنی جگہ آزادی کے ساتھ پاکستان کی تہذیب وثقافت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ فیض صاحب کوئی چار سال تک نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے چیئرمین رہے مگر انہی لوگوں نے جن کو وہ خود اس ادارے میں اہم عہدوں لائے تھے۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر لیے تھے کہ فیض صاحب کا دل اکھڑ گیا تھا اس سلسلے میں ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں:

''حسب معمول انہوں نے کسی شکایت نہ کی کسی قسم کی تلخی کا اظہار کیا۔ فقط وزیر اعظم بھٹو سے مل کر یہ کہا میری دونوں بچیاں چونکہ لاہور میں ہیں اور اس عمر میں میری خواہش ہے کہ ان کے پاس رہوں۔''۸۵

انہوں نے اپنے پرانے دوست اور ماہر موسیقی خورشید انور کی مدد سے آہنگ خسروی اور کرانہ گھرانے کی موسیقی کی تدوین کے لیے ایک علیحدہ مرکز کی بنیاد رکھی اور اس کے سربراہ بن کر لاہور چلے گئے۔

پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کی سرگرمیاں:

شروع شروع میں تو اس ادارے کے لیے بہت سی مشکلات تھیں لیکن آہستہ آہستہ اس کونسل نے ترقیاتی کام شروع کر دیے تھے۔ خالد سعید بٹ کو فیض صاحب کراچی سے لائے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو ایک نیشنل تھیٹر کا بنایا پھر راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ایک درامہ تھیٹر بنوایا اور اس طرح ڈرامے کی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا گیا۔ پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے زیر اہتمام ایک نیشنل آرٹ گیلری کے قیام کا منصوبہ ان کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔ اسے ایک الگ شعبے کے طور پر قائم کروایا گیا اور پورے ملک کے مصوروں کے فن پاروں کو جمع کرنے کا باقاعدہ آغاز لیا گیا۔ پرفارمنگ آرٹ کا شعبہ بھی قائم کروایا اس کے ماتحت نہ صرف پاکستانی لوک فنکاروں کو ایک ساتھ اکٹھا کیا بلکہ اسی زمانے میں بیرون

ممالک سے بھی ثقافتی طائفوں کی آمد بڑھ گئی۔فیض صاحب کے دور میں پی۔این۔سی۔اے نے اپنے دائرہ کار کو صرف اسلام آباد تک محدود نہیں رکھا بلکہ ملک کے دوسرے صوبوں میں جو مقامی آرٹس کونسلیں تھیں ان سے رابطے کا کام بھی اپنے ذمے لے لیا تھا۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ پاکستان کی بنائی گئی کونسل کو شروع میں بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔پاکستان کی تاریخ میں یہ ثقافتی ادارہ نوزائیدہ تھا۔اس کی پرورش اور دیکھ بھال کا ذمہ ایسے لوگوں نے اٹھایا جن کو اس کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ڈاکٹر خالد سعید بٹ سے لے کر مستری چراغ دین تک اور فیض احمد فیض سے لے کر ڈرائیور یونس تک سبھی آرٹ کی مالا میں لگے ہوئے تھے۔

فیض صاحب کو پی این سی اے میں زیادہ دیر تک ٹھہرنے نہیں دیا۔ان کے خلاف مخالفت اتنی ہو چکی تھی کہ وہ ایک دن خاموشی سے اٹھ کر لاہور چلے گئے لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں سے جو ثقافت کا پودا لگایا تھا وہ کئی رکاوٹوں اور مشکلات کے ہوتے ہوئے اپنی ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔اگر فیض صاحب اس کام کی ابتدا نہ کرتے تو آج نہ پی این سی اے ہوتا اور نہ ہی لوک ورثے کا ادارہ۔

بحیثیت چیئرمین فیض صاحب کا دورہ بنگلہ دیش:

بھٹو صاحب کے دور حکومت میں فیض صاحب پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس کے چیئرمین تھے۔۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد فیض صاحب پاکستانی وفد کے ہمراہ بنگلہ دیش گئے۔یہ وفد بھٹو صاحب کی قیادت میں پہنچا تھا۔فیض صاحب نے واپسی پر انٹرویو دیتے ہوئے ڈاکٹر ایوب مرزا کو اپنے دورے کے بارے میں آگاہ کیا۔

''بھئی کچھ بھی نہیں ہوا۔بس جیسے گئے تھے ویسے ہی لوٹ آئے۔پہلے دن رسومات ہوئیں۔دوسرے دن ہمیں شہیدوں کے مزار پر پھول چڑھانے جانا تھا۔اب

اطلاع ملی کہ وہاں جانا خطرناک ہے۔''۸۶

وہاں خطرہ تھا کہ کوئی مظاہرہ نہ ہو جائے۔ مجیب اور بھٹو صاحب اصرار کر رہے تھے کہ یہ رسم ضروری ہے مگر سردار شوکت حیات، مصطفیٰ کھر اور آغا شاہی کا خیال تھا کہ نہ لے جایا جائے۔ ہم لوگ گاڑیوں میں مزار تک پہنچے اور بھٹو صاحب ہیلی کاپٹر کے ذریعے آئے۔ کچھ لوگوں نے مظاہرہ بھی کیا۔ پھول چڑھانے کے بعد بھٹو اور مجیب بات چیت کے لیے سکریٹریٹ چلے گئے۔ ہمارے لیے پیغام دے گئے اگر آپ کی ضرورت پڑے گی تو آپ کو بلوالیں گے۔ پھر ہم سمجھ گئے تھے کہ بات چیت میں ڈیڈلاک ہو گیا ہے کیونکہ مجیب الرحمان نہیں مانا۔ اس نے اپنا موقف نہیں چھوڑا وہ ایک ہی بات پر قائم تھا کہ پہلے حساب کتاب بعد میں تعلقات۔ بھٹو صاحب نے کہا یہ معاملات عجلت میں حل نہیں ہوا کرتے۔ اس کے لیے ایک متفقہ مشترکہ کمیٹی تشکیل دے دیتے ہیں اور یہ کمیٹی تمام حساب کتاب کی چھاب بین کر لے گی لیکن مجیب نہیں مانا۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ جب ہم ڈھاکہ پہنچے تو پورا شہر استقبال کے لیے آیا ہوا تھا اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ ایک سوال کے جواب میں فیض صاحب نے بتایا کہ مجیب بڑے تپاک سے بغل گیر ہوا اور کچھ لکھنے کی بھی فرمائش کی۔ فیض صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ ضرور لکھیں گے۔ تخلیقی سطح پر اس دورے نے فیض صاحب کو بہت متاثر کیا تھا اور اس دورے سے جو مایوسی ہوئی تھی اس کا اظہار فیض صاحب نے بھی کر دیا تھا۔

ڈھاکہ سے واپسی:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مدارا توں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

فیض صاحب نے بتایا کہ انہوں نے یہ غزل مجیب کو بھجوادی تھی۔

پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس سے کوچ:

جن دنوں فیض صاحب اسلام آباد میں نیشنل کونسل آف دی آرٹس میں چیئر مین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ان دنوں فیض صاحب سوویت یونین گئے ہوئے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کو نیشنل کونسل آف دی آرٹس کی سربراہی سے ہٹا کر مشیر تعلیم بنا دیا گیا۔ جو بظاہر فیض صاحب کے دوست تھے ان کی مخالفت میں آگے تھے۔انہوں نے فیض صاحب کی واپسی کا انتظار بھی نہیں کیا۔اس ادارے کے ڈائریکٹر بن بیٹھے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کو ذوالفقار علی بھٹو کی ہدایت پر پی این سی اے کا مشیر بننے کی آفر کی لیکن فیض صاحب نے یہ کہا کہ جب سرکار کو ہمارے مشوروں کی ضرورت پڑے تو یاد کر لیا کرے۔یوں فیض صاحب ۱۹۷۴ء میں لاہور چلے گئے۔ یہاں انہوں نے کلاسیکی موسیقی کے لیے ایک ریسرچ سیل بھی قائم کیا۔چند سال کام کیا ضیاءالحق کا مارشل لگ گیا اور فیض صاحب مایوس ہوکر ملک سے باہر چلے گئے۔

فیض صاحب کو دل کا دورہ:

لاہور آرٹس کونسل کی انتہائی مصروف زندگی اور حکومتی اداروں کی طرف سے مسلسل دباؤ سے فیض صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی۔مشرقی پاکستان سے واپسی پر ان کو دل کا دورہ پڑا۔اس کی تصدیق میں سبط حسن بھی لکھتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے پشاور، راولپنڈی، کراچی اور لاہور کی آرٹ کونسلوں کے سربراہان کا ڈھاکہ میں ایک اجلاس طلب کیا گیا حالانکہ فیض صاحب اس اجلاس کے اغراض ومقاصد سے اچھی طرح واقف تھے لیکن شریک تو ہوئے۔واپس آتے ہی ان

پر دل کا دورہ پڑا اور وہ تین ماہ تک بستر پر پڑے رہے۔ بقول ایوب مرزا:

''فیض کو ہارٹ اٹیک ۱۹۵۸ء" میں ہو چکا تھا۔''۸۷

ایوب مرزا نے سن ٹھیک نہیں بتایا جبکہ فیض صاحب کو ہارٹ اٹیک ۱۹۶۲ء میں ہوا تھا۔ انہیں دنوں فیض صاحب اپنی بڑی بیٹی سلیمہ کے ساتھ ماسکو لینن امن انعام لینے گئے تھے اور وہ بھی بحری جہاز سے کیونکہ فیض صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ہوائی جہاز سے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد فیض صاحب نے ہارٹ اٹیک کے عنوان سے ایک بہت خوبصورت نظم لکھی جو ان کے مجموعہ کلام سر وادی سینا میں بھی شامل ہے۔

ہارٹ اٹیک:

درد اتنا تھا کہ اس رات دل وحشی نے
ہر رگ جاں سے الجھنا چاہا
ہر بن مو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دور ترے صحن میں گویا
پتا پتا مرے افسردہ لہو میں ڈھل کر
حسن مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا

فیض احمد فیض اور فلم سازی:

فیض صاحب ۱۹۵۵ء میں جیل سے رہا ہوئے اور پاکستان ٹائمز میں بھی بحال ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی

انہیں فلم بنانے کا شوق پیدا ہوا۔فیض صاحب نے دو پاکستانی فلموں کے گانے اور مکالمے لکھے ایک تو فلم ''جاگو ہوا سویرا ''اس کے ڈائریکٹر اے جے کاردار تھے۔اس فلم کو بین الاقوامی ایوارڈ بھی ملا اور دوسری فلم ''دور ہے سکھ کا گاؤں'' جو تکمیل کے مراحل سے تو گزری تھی مگر ریلیز نہیں ہوسکی۔فلم ''جاگو ہوا سویرا'' کے متعلق احمد سلیم لکھتے ہیں:

''۱۹۵۰ء کی دہائی میں بننے والی یہ فلم، جس کو ابھی تک پاکستانی فلم سازی میں سب سے سنجیدہ اور اعلیٰ تخلیقی کوشش کہا جاسکتا ہے۔''۸۸

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فیض صاحب کی فلم کہا جاتا ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ چونکہ یہ ناول بنگال کے پس منظر میں لکھا گیا تھا اس لیے اس فلم کی شوٹنگ مشرقی پاکستان میں ہوئی اور یہ ۱۹۵۸ء میں مکمل ہوئی۔یہ فلم تکمیل کے مراحل سے گزر کر اگلے برس اس کو نمائش کے لیے چنا گیا جب یہ فلم مغربی پاکستان پہنچی تو وزیر اطلاعات ونشریات خواجہ شہاب الدین نے اس پر پابندی لگادی کہ اس سے اشتراکیت کی بو آتی ہے۔فیض صاحب نے ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں نیف ڈیک کے باہمی اشتراک سے ایک اور فلم بنانے میں بہ حیثیت پروڈیوسر حصہ لیا تھا جو ایک نازک مسئلہ بن گیا تھا۔جس فلم نے فیض صاحب کو پریشان کیے رکھا وہ ''دور ہے سکھ کا گاؤں'' ہے۔ایک جگہ پر عطا الحق قاسمی صاحب نے فیض صاحب سے اس فلم کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا مسئلہ یہ تھا کہ ابھی اس فلم کا نام طے نہیں ہوا تھا۔جب یہ فلم مکمل ہوگئی تو اس دور میں حکومت تبدیل ہوگئی تھی چنانچہ انہوں نے غلطی سے فیصلہ کیا تھا کہ اس فلم کو بین الاقوامی میلے میں نمائش کے لے بھیجنا ہے فیض صاحب نے لندن سے اس کی پرنٹنگ کرائی تھی۔اس کی ساؤنڈ میں کافی مسئلہ تھا۔ہدایت کار کاردار اور نیف ڈیک والوں کا آپس میں جھگڑا چل رہا تھا۔انہوں نے پانچ چھ ماہ سے ان کو تنخواہیں نہیں دی تھیں ابھی یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ مارشل لاء لگ گیا تھا اس میں کافی مشکلات آئیں۔فلم ساؤنڈ کی درستگی کے لیے ہدایت کار کے پاس پڑی ہوئی تھی۔انہوں نے ہدائت کا کو قانونی نوٹس بھیج دیا کہ ہماری تنخواہ دو۔ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے تمہاری کوئی تنخواہ نہیں دینی۔اس

واقعے نے بہت کافی طول پکڑا اور فیض صاحب بہت رنجیدہ اور افسردہ ہوئے۔فیض صاحب نے اقبال پر ایک دستاویزی فلم تیار کی جس میں فقیر وحیدالدین نے ان کی مدد کی مگر اس پر پابندی لگادی گئی۔

چین روس کا جھگڑا:

عالمی سطح پر روس چین کے جھگڑے نے سوشلسٹ تحریک میں میں تفرقہ ڈال دیا تھا چھوٹی چھوٹی پارٹیاں بنائی جارہی تھیں۔فیض صاحب پاک روس دوستی کی انجمن کے لیڈر رتھے۔فیض صاحب پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ وہ روس کی زیادہ حمایت کرتے ہیں۔حالانکہ اس سلسلے میں فیض صاحب نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو بتایا کہ میں نے تو چین پر تین نظمیں لکھی ہیں۔روس پر ایک بھی نہیں لکھی۔ مجھے یہ چین روس کا جھگڑا پسند نہیں۔کیونکہ روس ایک بڑا ملک ہے اور اس نے پانچویں دہائی میں چین سے اپنے سارے ترقیاتی منصوبے واپس لے لیے تھے۔دونوں چوہدری بنتے ہیں۔چین نے بھی حیرت انگیز ترقی کر لی تھی۔فیض صاحب سرمایہ داری نظام کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر روس میں سرمایہ دارانہ نظام رائج ہو جائے پہلے تو ایسا نہیں ہوگا اگر ہو گیا تو دنیا بھر کی مزدور اور کسان تحریکوں کو بہت صدمہ پہنچے گا اور خودکشی کو حرام سمجھتا ہوں شاید ایسا کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔اگر کسی ملک میں انقلاب آتا ہے تو سماج کے ہر فرد کو قربانی دینی پڑتی ہے۔اس پر فیض صاحب کہتے ہیں کہ روس میں جب انقلاب آیا تو وہاں کے لوگوں نے بے مثال قربانیاں دیں۔فاشزم کو شکست دی۔چینیوں نے روس سے بھی بہت کچھ سیکھا۔

بھوپال میں جشن فیض:

۱۹۸۷ء میں فیض احمد فیض کا جشن بھارت کے متعدد شہروں میں جوش وخروش اور علمی وفکری انداز میں منایا

گیا۔لکھنو میں بھی فیض صاحب کا جشن منایا گیا یہاں تک کہ لکھنو یونی ورسٹی والوں نے فیض صاحب کی کافی پذیرائی کی۔ یہاں پر میں ۱۵ستمبر ۱۹۷۸ء کی ایک شام کا ذکر کروں گی جس میں بھوپال کے ایک شہر ٹیگور بھون میں منعقد ہوا جس کی صدارت کے فرائض اس وقت کے وزیراعظم نے انجام دیے تھے۔اس کے انتظامیہ میں پروفیسر قمر رئیس تھے اور انہوں نے ایک بھرپور مقالہ بھی پڑھا تھا۔ یہاں پر فیض صاحب نے بھی خطاب کیا تھا۔ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب کے خطاب بھوپال کو یوں پیش کرتے ہیں۔

''ہر چند کہ ہمارا کام الفاظ کی بازی گری کرنا ہے مگر ایسے موقع بھی آجاتے ہیں کہ الفاظ ناکام ہو جاتے ہیں۔آج میری جس طرح پذیرائی آپ نے کی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔آپ کا شہر حسین اور تاریخی شہر بھوپال جس میں ہم کو دوبارہ حاضری کا موقع ملا ہے، پہلی بار قیام مختصر رہا اور تشنہ۔''۸۹

میری یہ خواہش تھی کہ اس تاریخی اور خوبصورت شہر کو جی بھر کے دیکھوں اور آج میری یہ خواہش پوری ہوگئی ہے کہ اس شہر میں دوبارہ آیا ہوں اور آپ لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع بھی ملا۔

فیض صاحب کی شخصیت ہی ایسی تھی جہاں جاتے تھے وہیں ان کی پذیرائی ہوتی تھی۔کیونکہ آج تک فیض صاحب نے نے اپنے ملک کے بارے میں نامناسب الفاظ استعمال کے ہوں۔ ہمیشہ ملک کی عزت کی بات کی یہاں تک کہ ان کا بدترین دشمن بھی اس بات کی گواہی دے گا کہ کوئی ان کے خلاف کتنی ہی سخت بات لکھ دے تلخ جواب نہیں دیتے تھے۔

فیض صاحب نے ایک واقعہ بھی سنایا کہ ایک بار ہم ماسکو سے واپس آرہے تھے۔وہاں ایئرپورٹ پر ہماری بیٹی

بھی لندن سے واپس آ رہی تھی۔ الوداع کہنے کے لیے ہمارے دوست احباب کافی تعداد میں موجود تھے۔ جب ہم جہاز میں اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھ گئے تو ایک آدمی نے ہم سے پوچھا کہ آپ کسی جگہ کے وزیراعظم ہیں یا بزنس مین ہم نے کہا کہ یہ ہمارے دوست ہیں ہم سے محبت کرتے اور محبت پاتے ہیں۔

فیض صاحب کا مزاج ہی ایسا تھا وہ لوگوں سے محبت کرتے تھے اور لوگ ان سے بے پناہ محبت پاتے تھے کیونکہ فیض صاحب کو دولت سے کوئی پیار نہیں تھا۔

ویت نام کی جنگ آزادی اور فیض:

سرمایہ دار اور جاگیردار ہمیشہ سے لڑتے آئے ہیں وہ مزاحمت اور لڑائی جھگڑا چاہتے ہیں۔ اس تصادم کو روکنے کے لیے ہاتھ اٹھانے پڑتے ہیں عقل و فراست کی ضرورت پڑتی ہے۔ ویت نام میں تو سامراجیوں اور مقامی لوگوں نے مل کر ظلم کے بل بوتے پر ایک خطرناک اور ناقابل تسخیر طاقت کی طرح وہاں کے لوگوں پر حملہ آور ہوئے۔ ویت نام کے لوگوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر فیض صاحب نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

> ''بھئی ویت نام کے عوام تو فرانس یا امریکہ سے جنگ کرنے نہیں گئے تھے۔ یہ جنگ تو سامراجیوں کی طرف سے ان پر تھوپی گئی تھی اور جب ظالم سامراجی ہو یا مقامی تو پھر ان کے ظلم کے خلاف احتجاج ضروری ہوتا ہے''۹۰

میدان جنگ میں ردعمل نہ دکھایا جائے اور خاموشی اختیار کی جائے تو نہ صرف یہ بددیانتی بلکہ خودغرضی کا عمل کہلاتا ہے۔ ویت نام کے لوگوں کا کارنامہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے اتنے بڑے قومی ہیکل اور خطرناک دشمن کو خاطر میں نہ لاتے

ہوئے جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور اس کا مظاہرہ بھی کر دکھایا۔ آخر کار انہوں نے کامیابی حاصل کر لی تھی یوں دنیا کی سپر پاور کو شکست دے دی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد فاشزم نے یورپ میں زور پکڑا اور ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لینے کا فیصلہ کر لیا اور اس کا نتیجہ دوسری عالمگیر جنگ کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ پھر جس طرح چینیوں نے ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں سوشلسٹ انقلاب برپا کیا اور ایک سوشلسٹ ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو انگریزوں کی صدیوں کی غلامی سے آزادی ملی اور پاکستان معرض وجود میں آیا۔ آزادی لینے کے لیے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں تب جا کے آزادی ملتی ہے۔ ویت نام کی جنگ آزادی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ امریکہ نے ملک کو خاکستر کا ڈھیر بنانے کی پالیسی پر عمل کیا ہر وہ حربہ استعمال کیا جو کسی انتہائی ظالم نظام کی ایجاد ہو سکتا ہے پھر بھی ویت نام کی فتح ہوئی اور اس فتح نے جنوب مشرقی ایشیا پر سیاسی اور انقلابی اثر ڈالا جس سے مقامی ظالم حکومتیں اور سامراج خوف زدہ ہیں کیونکہ ان کو اپنی شکست نظر آ رہی ہے۔ ویت نام میں ''حریت ناميوں'' کی فتح ایک عظیم فتح ہے۔ اس جنگ میں ویت ناميوں کی جرات اور حوصلہ مندی کی داد دینی

فیض احمد فیض اور ٹیکسلا یونیورسٹی منصوبہ:

پروفیسر قدرت اللہ فاطمی آر، سی، ڈی میں ڈائریکٹر کے عہدے پر پہنچ چکے تھے فیض صاحب سے بار بار بدھ مت یونیورسٹی کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اور فیض صاحب نے بین الاقوامی درس گاہ پر سوچنا شروع کر دیا۔ یہ بات آگے بڑھ کر ایک منصوبہ کی شکل اختیار کر گئی اور اگست ۱۹۷۳ء تک قدرت اللہ فاطمی کی بریک بین نظر نے پالی اور بدھ مت کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹیکسلا کے مقام کے لئے باقاعدہ کام کرنا شروع کر دیا۔ انہیں تحریری شکل دے دی۔

دسمبر ۱۹۷۳ء میں یونیسکو نے ایشیا میں ثقافتی سرگرمیوں کو فعال اور مظبوط کرنے کے لئے، حکومت کے نمائندوں

کے درمیان ایک کانفرنس قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں انڈونیشیا کے قدیم تہذیبی، تاریخی اور علمی مرکز Yogyakarta کو منتخب کیا۔ وزیر تعلیم وثقافت واطلاعات جناب عبدالحفیظ پیرزادہ پاکستانی نمائندوں کے قائد مقرر ہوئے اور فیض صاحب اس کے رکن تھے۔ یہ بھی قرار پایا تھا کہ انڈونیشیا میں قائم کرنے والے پاکستانی سفیر اس کے دوسرے رکن ہوں گے لیکن جناب عبدالحفیظ پیرزادہ روانہ نہ ہو سکے۔ ان کی جگہ جناب محمود علی کو جو پاکستانی کابینہ کے مشرقی پاکستانی رکن تھے اس وفد اک نمائندہ بنا دیا گیا۔ فیض صاحب نے اس سے متعلق رپورٹ (Education and culture ministry)ECM کے لئے مرتب کی۔ جس میں ٹیکسلا کے مقام پر ایک انٹرنیشنل ثقافتی سنٹر آف بدھ مت اور ہائی اسٹڈیز کی بنیاد رکھنے کی تجاویز دی گئیں۔ فیض صاحب کی یہ رپورٹ اس سلسلے میں بہت اہم ثابت ہوئی۔

آخر کار یہ لوگ جکارتہ میں قائم ہونے والی بین الحکومتی یونیسکو کانفرنس میں پاکستانی وفد کے اراکین یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ پاس کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ چونکہ اس کا سارا کریڈٹ فیض صاحب کو جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۵ جنوری ۱۹۷۴ء کو حکومت سے اس منصوبے کو آگے بڑھانے کے لئے ایک تفصیلی خط بھی لکھا۔ ٹیکسلا یونی ورسٹی کا منصوبہ کاغذوں میں بھی آگے بڑھا، اور پروفیسر قدرت اللہ فاطمی نے فیض صاحب کی موجودگی میں ایک باقاعدہ شکل دے دی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل یونیسکو مسٹر فوبس (MR. Fobes) سے پاکستانی وفد کی سفارشات کے متعلق تفصیلی بات کی۔ سفارشات جکارتا کانفرنس میں منظور کی جا چکی تھیں۔ فیض صاحب نے مسٹر فوبس سے اپنی گفتگو کے متعلق ۲۶ فروری ۱۹۷۴ء کو حکومت کو تحریری طور پر آگاہ کر دیا اور فوری طور پر نوٹس لینے کی درخواست کی۔ ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کی فیض صاحب نے اس منصوبے کو پاس کرانے کے لئے کتنی جدوجہد کی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس میں بطور چیئرمین کام کر رہے تھے۔ ان کے ٹیکسلا منصوبے کی خبر سب سے پہلے پاکستان ٹائمز نے چھاپی پھر ڈان نے پھر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی

کہ اس یونی ورسٹی کی وجہ سے بدھ مت پھیلے گا۔ یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اصولوں کے خلاف ہوگا۔ گویا ایک انتہائی قدم تھا اور پھر یونیورسٹی کا یہ منصوبہ ملاؤں کی نظر ہوگیا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد نہ ہوسکا مگر اسے منسوخ نہیں کیا گیا تھا۔ فیض صاحب اس منصوبے کی تکمیل نہ کر سکے اور اس جہاں سے ۱۹۸۴ء میں انتقال کر گئے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ۱۹۹۱ میں پروفیسر قدرت اللہ فاطمی نے اس منصوبے کو نئے سرے سے ترتیب دے کر تازہ نکات لکھ کر تحریری طور پر حکومت کو پیش کر دیا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا پروفیسر قدرت اللہ فاطمی نے اپنی خدمات بغیر کسی معاضہ کے بحیثیت پروفیسر ایمرٹیس آف انڈس مسلم اسٹڈیز پیش کر دیں، انہوں آثار قدیمہ کی چیئر پر احمد حسن دانی کو مقرر کر دیا۔ فاطمی صاحب نے ڈاکٹر عبدالرحمن ایسوسی ایٹ پروفیسر پشاور یونی ورسٹی کا نام بھی بطور ماہر آثار قدیمہ مقرر کر دیا۔ ان کی اسلام آباد میں ملاقات ڈاکٹر محمد افضل سابق وزیر تعلیم سے ہوئی۔ فیض اور ٹیکسلا یونی ورسٹی کے متعلق بات ہوئی۔ ڈاکٹر محمد افضل، پروفیسر قدرت اللہ فاطمی، اور ڈاکٹر احمد حسن دانی پر عزم ہیں کہ یہ منصوبہ پاس ہو کر رہے گا۔

افغانستان کی جنگ اور فیض احمد فیض:

ترکی کے کہنے پر افغانستان میں سویت یونین کی افواج کی آمد سے ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ سویت یونین نے اس فوجی کاروائی کو دونوں ملکوں کے دفاعی مفاد میں ایک اہم قدم سمجھا اور اس کو اپنی حدود میں رکھنے کا عزم کیا۔ مگر واشنگٹن کے ایوانوں میں خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ پاکستان میں جنرل ضیاء کی حکومت تھی جس نے افغانستان کی صورت حال کے مطابق ترکی کی کمیونسٹ حکومت کو خوش آمدید کہا۔ جنرل ضیاء اور اس کے ساتھیوں نے سرخ فوج کو درہ خیبر کی طرف مارچ کرتے ہوئے اسلام آباد کی طرف بڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔

واشنگٹن نے جنگ کا اعلان کر دیا اس کے ساتھ ہی مغربی دنیا کی توجہ افغانستان کی طرف ہوگئی۔ میڈیا نے سویت

یونین کی اس فوجی کاروائی کو افغانستان میں زبردستی قبضہ قرار دیا اور اس کے ساتھ ہی ترکی کی انقلابی حکومت کے اقتدار اعلیٰ پر ناجائز قبضہ کی مذمت کی۔ افغانستان میں سرخ انقلاب کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے سامراجیوں نے نئی منصوبہ بندی کی۔ آخر کار پاکستان نے بھی بھرپور ساتھ دیا صدر رونالڈ ریگن سے مذاکرات کرنے کے بعد جنرل ضیاء پاکستان واپس آئے تو فضا بدل چکی تھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ تربیت یافتہ فوجی رضا کار پاکستان سے روانہ ہو کر قبائلی علاقے سے گزر کر کابل پر حملہ آور ہوئے یوں ایک نہ ختم ہونے والا جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پاکستان رضا کاروں کا بیس کیمپ بن گیا۔ یہیں پر ان کو تربیت دی جانے لگی امریکہ اور دوسری استعماری طاقتوں نے آٹو میٹک ہتھیار، راکٹ اور میزائل وغیرہ بھی اس جنگ میں استعمال ہوئے اور جنرل ضیاء کی موجودگی میں سویت یونین کی افغانستان میں مقیم فوج کے خلاف کھلم کھلا افغان مجاہدین کی فوجی کاروائیوں کا گڑھ بن گئی۔ پوری مغربی دنیا کی عسکری اور فلاحی توجہ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے اور افغانستان کی طرف تھی، دوسری طرف مہاجرین کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ پشاور اور مغربی سرحدی صوبے کے دوسرے علاقوں میں مہاجرین کے کیمپ بڑھتے جا رہے تھے۔ ان مہاجرین کے لئے یو۔این۔او اور سامراجی طاقتوں کے فلاحی اداروں کی طرف سے ان کے لئے کھانے پینے کی اشیاء پہنچائی گئیں۔ اشیاء وافر مقدار میں پہنچائی گئیں جو بعد میں اسمگل ہو کر پورے ملک میں دستیاب تھیں اور یوں جماعت اسلامی اور اس کے پیروکاروں کی حکومت چلتی تھی۔ اس سارے آپریشن کی نگرانی فوج کے محکمہ انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی۔ایس۔آئی) کے کنٹرول میں تھی۔

راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان آزاد کشمیر کا ایک اہم فوجی سنٹر تھا عوام کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے اندر کیا ہوتا ہے اور اس میں کونسے ذخائر چھپے ہوئے ہیں۔ ایک دن ذوردار دھماکہ ہوا جڑواں شہروں میں اس دھماکے کی شدت کو محسوس کیا گیا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ حملہ کس نے کیا تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کام بھارت کا ہے کافی دیر بعد

ریڈیو پر خبر چلی کہ اوجھڑی کیمپ میں اسلحہ کے ذخائر میں آگ لگ گئی ہے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس جنگ سے کافی تباہی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ اس آگ پر تو قابو پا لیا گیا لیکن لوگوں کے دلوں میں جو آگ بھڑک رہی تھی اس کو کم کرنا مشکل تھا کہ افغانستان کی جنگ میں پاکستان کو کیوں ملوث کیا گیا، جگہ جگہ افغانستان کی جنگ کے بارے میں لوگ اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔

اوجھڑی کیمپ کے سانحہ والے دن فیض صاحب راولپنڈی میں تھے۔ وہ افغانستان کے حالات سے نہایت غیر مطمئن اور افسردہ تھے۔

فیض صاحب ڈاکٹر ایوب مرزا سے افغانستان کی جنگ پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

''اگر آپ اس تنازعے کا بیس کیمپ بنیں گے تو یہی کچھ ہوگا۔ بھئی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ آپ رضا کاروں اور مجاہدین کو عسکری اور اسلحہ کی تربیت اپنی سرزمین پر دے رہے ہیں۔ بیرونی طاقتوں سے لیا اعلیٰ ترین اسلحہ کا ذخیرہ کریں گے جس سے آپ کی قوم بے خبر ہوگی تو پھر اوجھڑی کیمپ جیسے دھماکے ہوتے رہیں گے۔ آپ کا ملک اس جنگ میں فرنٹ پوسٹ اور لانچنگ پیڈ بن چکا ہے۔''[۹۱]

ہم روس کی فوجوں کے افغانستان میں اس طرح داخلے کو ہم ٹھیک نہیں مانتے۔ ترکی کی حکومت کا قائم ہونا ان کا اپنا معاملہ ہے اس کے خلاف ہونے والی سامراجی سازشوں کی مذمت کرتے ہیں۔ مگر روس کو افغانستان پر حملہ آور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بیرونی مداخلت کا خاتمہ بہت ضروری ہے اور افغانستان کے لوگ جو مہاجروں کی زندگی گزار رہے ہیں انہیں اپنے ملک واپس چلے جانا چاہئے۔ اس سارے مسئلے کا حل سیاسی بات چیت سے ہونا چاہیئے۔ مگر یہ کام خاصا مشکل لگ رہا ہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے جب فیض صاحب سے پوچھا کہ پاکستانی ادیبوں اور شعراء نے افغانستان کے مسئلے پر اتنا زیادہ نہیں لکھا، جتنا فلسطین کی جنگ آزادی پر لکھا ہے۔ افغانستان کی کی صورت حال پر سب خاموش کیوں ہیں؟ فیض صاحب نے جواب دیا افغانستان اور فلسطین کا معاملہ ہی الگ ہے۔ افغانستان میں دو طبقے ہیں اور ان کے اپنے اپنے حمایت کرنے والے ہیں۔ جنہوں نے ان کی اپنے طریقے سے مدد کی۔ سب سے زیادہ مظلوم طبقہ افغان عوام ہیں۔

اس مسئلے کا سیاسی حل ہونا چاہئے کسی طرح افغانستان کی عوام کو جو دونوں طرف ظلم کی چکی میں پسے جا رہے ہیں اس سے آزادی دلائی جائے، سب افغانستان میں صلح اور صفائی سے اس مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ یہاں تک روس بھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ اس مسئلے کا سیاسی تصفیہ کیسے ہو۔؟ فیض صاحب بولے:

> ''فلسطینی مسئلہ تو افغانستان سے مختلف ہے۔ افغانستان بطور ملک موجود ہیں اور اس کے عوام بھی۔ فلسطینی بے گھر ہیں، بے یار و مددگار۔ ان کی صورت حال بہت مختلف ہے۔ ٹھیک ہے افغانستان میں روسی فوجیں موجود ہیں۔ لیکن ساتھ ہی جن کو مجاہدین کہتے ہیں جو یہاں ہیں اور ایران میں ہیں ان کے حامی بھی موجود ہیں۔ تصفیے کی کیا صورت ہو؟ یہ قصہ چل رہا ہے۔''۹۲

افغانستان ایشیاء کا سب سے پسماندہ ملک ہے۔ اس ملک میں بسنے والے بیشتر لوگ ایسے ہیں جنہوں نے نہ موٹر دیکھی ہے اور نہ ریل۔ ایک قبائلی اور شاہی نظام کا راج رہا ہے اور وہاں کے لوگوں کی تربیت اس طرح کی گئی ہے کہ اپنے سردار کی اطاعت کرو۔ اب نوجوان اس چیز کو اچھا نہیں سمجھتے وہ باہر سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں اپنے ملک میں قبائلی نظام کو بدلنا چاہتے ہیں لیکن یہ سب کیسے ممکن ہوگا، بہت سے لوگ اس نظام کو بدلنے کے حق میں نہیں ہیں انگریزوں نے امان اللہ خاں کو شکست دی اس وقت یہاں پر امان اللہ کے حق میں تحریک چلی قندھار چلو، قندھار چلو۔ اس وقت یہاں پر امان اللہ

کے حق میں تحریک چلی تھی۔ قندھار چلو، قندھار چلو۔ اگر پانچ ہزار سال کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شر کی قوتوں پر سچ کی جیت ہوتی ہے جبکہ یہ غلط تاثر ہے۔

تو فیض صاحب بولے نہیں بھئی ایسا نہیں ہے بے شک شر کی قوتوں کو فروغ تو ملتا ہے لیکن آخر کار سچ کو فتح ہوتی ہے۔ دو لڑائیاں ہمارے سامنے ہوئی ہیں۔ ہٹلر اور نازیوں نے شروع شروع میں پورے یورپ اور تقریباً آدھے ایشیاء پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت یہی لگتا تھا کہ اب جنگ ختم ہو گئی ہے ان کی تمام فوجی کامیابیوں کے بعد ان کی ہار ہوئی۔ پھر اس کے بعد الجیریا کے ساتھ فرانس کی لڑائی فرانس ایک بہت بڑا ترقی یافتہ ملک ہے۔ ویت نام کے ساتھ امریکہ کی لڑائی اور پھر اسرائیل اور فلسطین کی لڑائی چل رہی تھی آخر کار فتح پھر بھی فلسطینیوں کی ہوئی۔

افغانستان میں صرف افغانستان کی جنگ نہیں ہو رہی تھی۔ اس میں اور عناصر بھی شامل تھے سب سے زیادہ ظلم افغانی عوام برداشت کر رہے تھے۔ ویت نام کے بعد افغانی مظلوم ترین قوم ہیں۔ فیض صاحب نے جواب دیا ویت نام میں تو یک طرفہ جنگ ہو رہی تھی جبکہ افغانستان میں دو طرفہ لڑائی نہیں تھی بلکہ اور بھی طاقتیں ہیں جو اس وقت جنگ کو تیز کر رہی تھیں۔

سب سے مظلوم طبقہ افغانی ہیں، جنگ میں بیس پچیس لاکھ افغانی مہاجر ہو گئے تھے اس مسئلے کا کوئی حل ہونا چاہئے فیض صاحب پہلے ہی اس مسئلے کا حل چاہتے تھے کہ کوئی سیاسی حل نکلے اور مزید خون خرابہ نہ ہو۔ ۱۹۷۸ء میں فیض صاحب ملک سے باہر چلے گئے تھے اور ۱۹۸۲ء میں وطن واپس آئے تو اس طرح کی خبریں آ رہی تھیں کہ اگر فیض صاحب کو اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے کہا جائے تو شائد کوئی اس مسئلے کا حل نکل آئے اور جب نوائے وقت کے ایڈیٹر عارف نظامی نے اس مسئلے پر بات چیت کرنا چاہی تو فیض صاحب نے مختصر جواب دیا۔

ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔ یہ کام تو وہی کر سکتے ہیں جن کو کچھ اہمیت حاصل ہو یا سرکار کی طرف سے کوئی حیثیت

حاصل ہو۔ ہمارا کام تو لکھنا ہے اور ہم نے اس مسئلے پر کافی لکھا بھی ہے۔ مزید فیض صاحب کہتے ہیں کہ بطور دانش ور ہمیں دکھ ہوتا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک کے حالات جلد بہتر ہو جائیں۔

فیض احمد فیض بیروت میں:

فیض صاحب ۱۹۷۸ء میں راولپنڈی سے نکل کر ہندوستان اور انگلستان سے ہوتے ہی ماسکو جا پہنچے۔ ماسکو سے طبی معائنہ کرانے کے بعد فیض صاحب یاسر عرفات کی نگرانی میں شائع ہونے والے افروایشن جریدہ ''لوٹس'' کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو کر بیروت (لبنان) پہنچ گئے۔ یہیں سے فلسطینی جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نثار ترابی لکھتے ہیں کہ فیض صاحب ایک عرصے تک لبنان کے دارالحکومت بیروت میں جریدہ لوٹس کے مدیر رہے جو افریقہ اور ایشیاء کے ادیبوں کا ترجمان تھا۔ فیض صاحب کو لوٹس کی ایڈیٹری کی پیشکش یاسر عرفات کے مشیر ثقافت اور معروف شاعر معین بسیسو نے کی لیکن فیض صاحب نے اس پیشکش کو اس وقت قبول کیا جب ان کو یاسر عرفات کی طرف سے باقاعدہ اس کا دعوت نامہ بھیجا گیا۔ وہ یاسر عرفات کے کہنے پر لوٹس کے مدیر بن کر بیروت چلے گئے اور جب تک بیروت پوری طرح تباہ نہیں ہوا فیض بیروت میں رہے جس مکان میں وہ رہتے تھے اس کو بموں سے تباہ کیا گیا تھا۔

فیض صاحب نے انٹرویو کے درمیان بتایا کہ ان دنوں بیروت پی۔ ایل۔ او۔ کا ہیڈ کوارٹر تھا اس کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اسرائیلیوں نے اچانک سے بیروت پر حملہ کر دیا۔ اسرائیلی جارحیت پہلے سے متوقع تھی۔ میرا خیال تھا کہ اسرائیلی اپنی لڑائی جنوبی لبنان تک لڑیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا مزید حملے کے متعلق بتاتے ہیں۔

جب پہلے دن (۶ جون) کو بیروت پر پہلا ہوائی حملہ ہوا تھا۔ اس میں بہت سی جانیں چلی گئی تھیں۔ تو انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم انتقامی کاروائی کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ تھی کی اسرائیل کے مقبوضہ علاقے میں ان کا اپنا آدمی بچھی ہوئی بارودی

سرنگ سے مارا گیا تھا اور ان کے ایک مصور پر لندن میں گولی چلائی گئی تھی۔ اس کے بعد آٹھ تاریخ جون کو اسرائیل نے اپنی فوجیں لبنان میں داخل کر دیں تھیں اور اس کے بعد کبھی صبح، کبھی شام اسرائیل کی طرف سے حملے ہوتے رہتے۔ وہ نہ صرف پی۔ ایل۔ او کے دفاتر پر حملے کرتے تھے بلکہ شہری آبادی پر بھی بم پھینکتے تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ پی۔ ایل۔ او، ہتھیار ڈال دے تو ہم بھی کاروائی نہیں کریں گے اور ادھر پی۔ ایل۔ او نے کہا کہ ہم بھی اپنی لڑائی جاری رکھیں گے۔

فیض صاحب نے انٹرویو کے درمیان بتایا کہا سرائیلوں کو جنوبی لبنان جہاں پر فلسطینیوں کے کیمپ ہیں وہاں کچھ دیہات بھی ہیں جانے کی اجازت نہ مل سکی۔ انہوں نے جنوبی لبنان کو گھیرے میں لے لیا ان دیہاتوں اور کیمپوں پر بم گرائے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہاں پر رہنے والے لوگ بھاگ جائیں یا مر جائیں مزید فیض صاحب بتاتے ہیں۔

> ''دو ہفتے تک فلسطینیوں کی طرف سے مقابلہ ہوتا رہا۔ شام نے تیسرے ہی دن فائر بندی کرنی تھی۔ فلسطینیوں کا حوصلہ اور جرات قابل داد تھی۔ ایمبولینس، گاڑیاں، اسکول، اور ہسپتال مسلسل اسرائیلی بمباری کی زد میں رہے فلسطینیوں کے فلاحی اور ثقافتی مراکز بھی وحشیانہ بمباری سے متاثر ہوئے۔ یہاں پر فلسطینی قیادت کے لوگ تھے خاص طور پر یاسر عرفات۔ ایک گلی سے دوسری گلی ایک مکان سے دوسرے مکان تک بمباری ان کا تعاقب کرتی رہی۔ مگر ان کے حوصلے بہت بلند تھے اس دوران کھانے پینے کی اشیاء ملتی رہیں۔ ضروریات زندگی اور ادویات کی دکانیں کھلی رہیں۔ ان حالات میں جس قسم کا ڈر اور خوف ہوتا ہے وہاں اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔''۹۳

فیض صاحب نے انہیں بتایا کہ دو ہفتے بعد فلپ حبیب اور دوسرے ان معاملات کو نمٹانے کے لئے وہاں پہنچے۔ انہوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ پہلے آپ ہتھیار ڈال دیں اور شہر خالی کر دیں۔ یاسر عرفات نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر

دیااورایک ہفتے تک یہ معاملہ چلتا رہا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب مشکل ترین حالات کے باوجود لوٹس کے دفتر جاتے رہے اور اپنے فرائض سنجیدگی سے ادا کرتے رہے وہ فلسطینیوں کی جنگ آزادی میں ایک مجاہد سپاہی کی طرح شریک حال رہے۔ان کے دفتر پر بم گرے ان کا دفتر بھی تباہ ہو چکا تھا۔اسرائیل کے ساتھ یہ چوتھی لڑائی تھی۔پہلی جنگ ۱۹۴۸ء میں ہوئی اس وقت تین ممالک اردن،شام اور مصر کی فوجیں جنگ میں شامل تھیں مگر تین چار دن کے بعد ان کو شکست ہوئی۔دوسری لڑائی ۱۹۶۷ء میں بھی سات دن سے زیادہ نہ چلی اور پھر ۱۹۷۳ء میں اسرائیل سے جنگ ہوئی یہ سب جنگیں فوجوں اور حکومتوں کے درمیان تھیں۔موجودہ لڑائی فلسطینیوں نے خود لڑی۔جتنا جانی نقصان اسرائیل کا اس موجودہ جنگ میں ہوا اس سے پہلے تین جنگوں میں نہیں ہوا۔

سبط حسن لکھتے ہیں کہ بیروت کا خوبصورت شہر فیض صاحب کے فیض صاحب کے قیام کے دوران (۱۹۷۸ سے ۱۹۸۱ء) میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ہر گلی کوچے میں فوجی مورچے بنائے گئے تھے۔عمارتوں پر گولے برسائے جاتے تھے۔سڑکوں پر خون کے نالے جاری تھے۔فیض صاحب بھی فلسطینی مجاہد کی طرح اس جنگ میں شریک رہے۔وہ ان مختلف اور مشکل حالات میں فلسطینیوں کے جذبے سے بہت متاثر تھے اور اپنی کئی نظموں میں ان کو خراج تحسین پیش کیا۔

جس زمین پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارض فلسطین کا علم
تیرے اعداء نے کیا ایک فلسطین برباد
میرے زخموں نے کئے کتنے فلسطین آباد

معین بسیسو فلسطین کے مشہور و معروف انقلابی شاعر ہیں فیض بیروت جس گلی میں رہتے تھے اس کے سامنے معین

بسیسو بھی رہتے تھے۔ معین بسیسو کی چودہ پندرہ برس کی بیٹی نرس بن کر ہسپتال چلی گئی۔ دیگر ممالک سے بھی فلسطینی طلباء جنگ میں حصہ لینے کے لئے چلے گئے تھے پیرس سے مشہور شاعر محمود درویش وہاں پہنچ گئے تھے۔ فیض ان دنوں انقلابی شاعروں کے ساتھ رہے اور فلسطین پر نظمیں لکھتے رہے۔

میں جہاں پر بھی گیا اے ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں ہے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں ہے
تیری الفت تیری یادوں کی کسک ساتھ گئی

فیض صاحب نے یہ نظم ۱۹۸۰ء میں بیروت میں لکھی تھی۔

صابرہ اور شتیلہ کے کیمپوں میں پناہ گزین نہتے اور معصوم فلسطینی تھے جن پر ٹینکوں اور توپوں کی مدد سے ہونے والی اسرائیلی جارحیت نے اسرائیل کی بدترین دہشت گردی کا سارا چہرہ بے نقاب کر دیا تھا۔

اس کی تصدیق میں یاسر عرفات فیض صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب مجھے معین بسیسو نے پہلی بار فیض صاحب سے متعارف کروایا اور ہم لوگوں نے فلسطینی جنگ کے بارے میں گفتگو کی تو مجھے ایسے لگا کہ فیض صاحب ساری زندگی ہمارے درمیان رہے ہوں اور تمام مصیبتوں اور پریشانیوں میں ہمارا ساتھ دیا ہو۔ حالانکہ فیض صاحب ستر برس کے ہو رہے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اپنے ملک، اپنے ملک کے کسانوں اور مزدوروں کے حق میں جنگ لڑی۔ اپنی زندگی کے تمام سال تکلیف میں گزارے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی جگہ ہمارے درمیان، فلسطینی مجاہدین آزادی کے درمیان تھی۔ مزید یاسر عرفات فیض صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'فیض احمد فیض جیسا اردو کا سب سے بڑا اور عظیم شاعر، بین الاقوامی شہرت کا پاکستانی

نقلابی اور عالم اپنے ابدی خواب کی تکمیل کے لیے ہمارے درمیان آ پہنچا تھا۔''۹۴

فیض احمد فیض صرف ''لوٹس'' کے ایڈیٹر انچیف نہیں تھے بلکہ انہوں نے ہمارے ساتھ اور ہمارے درمیان رہنے کا فیصلہ کر لیا اس لیے نہیں کہ رسالے کا صدر دفتر بیروت میں تھا بلکہ اس عظیم انقلابی شاعر کا عظیم جذبہ اسے انقلابیوں کے پاس لے جاتا تھا، چاہے وہ کہیں بھی ہوتے اس بار ان کا جذبہ انہیں فلسطینوں کے پاس لے گیا تھا۔ محاصرہ بیروت کے دوران اسرائیلیوں نے امریکہ کی امداد اور اسلحہ کے زور پر فلسطینوں سے جو جنگ شروع کی تھی۔ اس دوران فیض صاحب سے کہا گیا کہ آپ بیروت چھوڑ دیں۔ حالانکہ ان کی جان کو خطرہ لاحق تھا مگر انہوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا میں اس زبردست جنگ کے دوران اپنے ابدی خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ میرا یہاں رکنا بہت اہم ہے۔ آخر میں عاسر عرفات فیض صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ فیض صاحب میرے دوست تھے اور جنگ بیروت میں میرے رفیق تھے۔ فیض صاحب ہمیں چھوڑ گئے لیکن ہمارے دلوں میں اپنی محبت کے نہ ختم ہونے والے نقش چھوڑ گئے۔ انہوں نے انقلابیوں، دانشوروں اور فنکاروں کی آنے والی نسلوں کے لیے بے پناہ اثاثہ چھوڑا ہے۔

فیض صاحب کی نظم ''فلسطینی بچے کے لئے لوری'' میں اس وحشت اور خونخواری کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کو پوری طرح بیان کیا گیا ہے۔ اس قیامت خیز جنگ میں دودھ پیتے بچے بھی موت کی گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بظاہر یہ نظم ایک طرف حوصلہ بلند کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے لیکن حقیقت میں بھی افسردہ اور پریشان حال لوگوں کے لئے امید کی ایک کرن ہے۔

مت رو بچے

رو رو کے ابھی

تیری امّی کی آنکھ لگی ہے

مت رو بچے

کچھ ہی پہلے

تیرے ابّا نے

اپنے غم سے رخصت لی ہے

مت رو بچے

تیرا بھائی

تیری باجی کا ڈولا پرائے دیس گیا ہے

مت رو بچے

تیرے آنگن میں

مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں

چندر مادفنا کے گئے ہیں

مت رو بچے

اس کے علاوہ فیض صاحب نے مجاہدین فلسطین کے لئے جون ۱۹۸۳ء میں ترانہ لکھا جو حقیقت میں سبھی مظلوم اور معصوم قوموں کا ترانہ ہے۔ جس میں وہ فلسطین کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہم جیتیں گے:

حقا ہم ایک دن جیتیں گے

بالآخر ایک دن جیتیں گے

کیا خوف زیلغارِ اعداء

فیض صاحب نے یہ ترانہ ۱۵ جون ۱۹۸۳ء کو بیروت میں لکھا تھا۔

اس وقت حالات اتنے خراب تھے کہ سڑکوں پر گولیاں چل رہی تھیں۔ راستے بند تھے مگر فلسطینیوں کے انتظامی امور میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ فلسطینی ایک بات پر قائم ہیں کہ انہیں اپنا فلسطین اپنا گھر ہر قیمت پر چاہیئے بقول فیض:

''فلسطینی قیادت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ لکیر کے فقیر نہیں ہیں۔ ان میں بہت لچک ہے۔ انہیں جیسی بھی صورت حال درپیش ہے وہ اس کے مطابق چل رہے ہیں۔ ٹھیک ہے ان کے ساتھ ایک زمانے میں اردن نے بھی ظلم کیا، ان کے ساتھ شامیوں نے بھی ظلم کیا۔ ان کو اور لوگوں نے بھی دغا دیا۔'' ۹۵

ڈاکٹر نثار ترابی لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کے آخری مجموعے ''میرے دل میرے مسافر'' کا انتخاب یاسر عرفات کے نام کیا گیا ہے اور اس مجموعے کی بہت سی نظمیں فلسطین کے لئے ہیں۔ ان کی پہلی نظم ''فلسطینی شہداء جو پردیس میں کام آئے'' ہے۔ فیض صاحب کی یہ نظم عالم امن کے لیے دیکھے گئے خوبصورت خوابوں کی تصویر ہے۔

فیض احمد فیض کی جیل کی اور جلاوطنی کی شاعری:

وہ جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے درمیاں ملک سے باہر چلے گئے اور بیروت میں ''لوٹس'' کو چلاتے

رہے۔تقریباً تین برس تک وہاں کام کیا اوراس دوران وہ یاسر عرفات کے ساتھ جدو جہد میں عملی طور پر ساتھ رہے۔اسی طرح وہ معین بسیسو اور محمود درویش کے ساتھ پی ایل او تحریک میں بھی شامل رہے۔

''میرے دل میرے مسافر'' فیض کی خود اختیار کردہ جلاوطنی کے دور کا کلام ہے۔وطن سے جسمانی طور پر دوری کے سبب فیض کے ذہن میں وطن سے قربت کا احساس شدید اور ایک نئی صورت حال پیدا کر دیتا ہے۔فیض صاحب روس میں ناظم سے مل چکے تھے اور محمود درویش جلاوطن شاعر رہے ہیں۔فیض صاحب ان کے متعلق بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں اور ہم میں فرق یہ ہے کہ وہ لوگ زبردستی نکالے گئے تھے جبکہ ہم اپنی مرضی سے وطن بدر ہوئے تھے۔ہمارا وطن واپس آنے کا جب دل کرے تو لوٹ سکتے ہیں۔بقول فیض:

> ''وطن سے دوری کا تو ایک اپنی جگہ رنج اور فراق ہے ویسے ہی جیسے اپنی محبوبہ سے دوری کا رنج اور فراق ہوتا ہے، درد اور کسک ہوتی ہے۔لیکن وہ جو فرق ہے جس قسم کی مجبوری ان لوگوں کو ہے وہ مجبوری تو ہمیں نہیں ہے۔ہمارا جب جی چاہے گا لوٹ جائیں گے۔''[۹۶]

فیض صاحب کا لندن اور بیروت کا کلام اسی جلاوطنی پر مشتمل ہے۔

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں

فیض صاحب کو وطن سے دوری کا بہت غم تھا فوجی آمریت کے ہاتھوں ملک اور اک رہنے والوں پر جو ظلم وستم

کے پہاڑ ٹوٹے ، مارشل لاء لگا ، آئین منسوخ ہوا ، اسمبلیاں ٹوٹیں اور وزارتیں ختم ہوئیں ۔ انہی دنوں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی بھی دی گئی ۔ فیض صاحب کا ساتواں مجموعہ کلام مرے دل مرے مسافر شائع ہوا جو ان کی جلاوطنی کے دور کی شاعری پر محیط ہے اور اس کتاب کا انتساب یاسر عرفات کے نام ہے ۔ فیض صاحب نے جلاوطنی کی زندگی میں جتنی نظمیں لکھی ہیں ان سب میں یہ نظم ''دل من مسافر من'' سب سے خوبصورت نظم ہے جس کو میں پہلے بیان کر چکی ہوں ۔ اس سلسلے میں احمد سلیم لکھتے ہیں کہ اس مجموعے کی ایک نظم ''ہم تو مجبور وفا ہیں'' فیض صاحب کی وطن سے محبت ، دردمندی اور مایوسی کی عکاسی کرتی ہے کیونکہ فیض صاحب کو اپنے وطن سے شدید محبت تھی اور وہ اپنے وطن سے دور نہیں رہ سکتے تھے ۔ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں ۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری ۔ وطن سے دوری نے ان کو بہت متاثر کیا ۔

فیض صاحب کی جیل کی شاعری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جیل کے حالات کی بدولت ان کی شاعری کا کینوس سکڑ گیا تھا اور ایک طرح سے محدود ہو گئی تھی ۔ جبکہ فیض صاحب اس بیان کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس سے ایک نئی جہت اور سمت ضرور پیدا ہو جاتی ہے ۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن پر انسان باہر رہ کر غور و فکر نہیں کرتا ۔ مصروفیات کی وجہ سے اس کی خوبی اور خامی نظر نہیں آتی اور انسان جیل جا کر زیادہ نازک ہو جاتا ہے اور پھر آدمی کے پاس زیادہ وقت ہوتا ہے وہ چیزوں کے بارے میں کھلے دل سے سوچتا ہے ۔ فیض صاحب بتاتے ہیں کہ ہم نے جیل جا کر افریقہ پر نظم کہی ۔

فیض صاحب سمجھتے تھے کہ جتنی آزادی جیل میں میسر آتی ہے اتنی باہر نہیں ہوتی ہے کیونکہ آدمی اپنی روزمرہ زندگی میں اتنا مصروف رہتا ہے ۔ اسے تخلیقی کام کرنے کی فرصت نہیں ملتی اسی حوالے سے جیل خانے میں دماغ زیادہ چلتا ہے ۔

فیض صاحب کے متعلق یہ سوال اٹھایا گیا کہ انہوں نے جیل میں رہ کر کافی اعلیٰ درجے کی شاعری کی ۔ یہ بھی

ضروری نہیں کہ عمدہ شاعری کے لئے جیل میں عمر بسر کی جائے۔ بہت سے لوگوں نے جیل کاٹی مگر وہ فیض نہ بن سکے۔ اس کے جواب میں فیض کہتے ہیں:

''یہ ٹھیک ہے کہ جیل خانہ میری شاعری کا زرخیز دور تھا۔ کیونکہ جیل خانے میں اور مصروفیت نہیں ہوتی ۔کوئی کام (اپائنٹمنٹ)نہیں ہوتی جیل کا زمانہ ایسا ہی ہے۔ جیسا پھر سے عشق کرلیا جائے۔ جیسے عشق میں خواہ مخواہ شعر بنتے چلے جاتے ہیں۔ انسان جذبات کی رو میں بہہ کر شعر کہتا ہی چلا جاتا ہے۔ جیل خانے میں بھی ایسا ہی ہے۔ جیسا آپ نے دوبارہ عشق کرلیا ہو۔''۹۷

فیض صاحب نے راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہو کر جیل میں قید تنہائی کی کافی لمبی سزا پائی اور اعلیٰ درجے کی شاعری کی اور یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ اگر جیل نا جاتے تو اتنا اعلیٰ درجے کی شاعری نہ کر پاتے۔ یہ ان کی شاعری کا بہترین دور تھا لیکن اعلیٰ پائے کی شاعری کے لئے جیل جانا ہرگز شرط نہیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کا جیل یاترا سے عوام کے ساتھ رشتہ ٹوٹنے کی بجائے زیادہ گہرا ہوا۔ کیونکہ ایک شاعر کا جیل جانا ایک نئی بات تھی اور پھر جیل کا دور تخلیقی طور پر فیض صاحب کے لئے اچھا ثابت ہوا۔ بقول فیض صاحب:

''میرے لئے جیل کا تجربہ ایسا ہی تھا جیسا جوانی کے آغاز میں پہلا عشق۔''۹۸

فیض صاحب اور شاعری میں روایت:

فیض صاحب شاعری میں روایت پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنی شاعری میں بنیادی طور پر ساری ترکیبیں، سارے استعارے تو وہی استعمال کیے ہیں جو ہماری روایتی شاعری کا حصہ ہیں۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ ہماری

اردو زبان یا جو اردو شاعری ہے۔ ہر زبان کے اندر کچھ داخلی بندیشیں یا کچھ لمٹیشنز ہوتی ہیں۔ ان سے نکلنا کسی بڑے شاعر کا کام ہے۔ ایک انٹرویو میں فیض صاحب سے پوچھا گیا کہ کبھی آپ کو نئی زبان یا نیا محاورہ استعمال کرنے کا شوق پیدا ہوا ،جیسا کہ آج کل کچھ لوگوں کو شوق ہے یا اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے جواب میں فیض صاحب کہتے ہیں کہ ایک حد تک اس فریم ورک کے اندر تو ہمیشہ ایجاد ہوتی رہی ہے۔ میر نے اور سودا نے اور نظیر اکبر آبادی نے اور غالب اور اقبال نے بھی اپنے طور پر اس میں تبدیلی کی ہے۔ بقول فیض:

''اس کو بدلا ہے۔ اس کا محاورہ بھی، اس کی لغت بھی، اس کی امیجری بھی، اس کی ہیئت بھی، کسی نہ کسی حد تک تھوڑی بہت کوشش ہم نے بھی کی ہے۔ اس سے آگے جانے کی ہمت نہیں ہوئی ہمیں۔''۹۹

دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ نظم اور نثر کا فرق تو قائم رہنا چاہیے اور جیسا کہ ان دونوں کے نام سے ظاہر ہے کہ نظم کا مطلب ہے کہ قاعدہ۔ کسی نہ کسی قاعدے کی پابندی تو ضروری ہے نا اور نثر نام ہے چیزوں کے بکھیرنے کا نام اور قاعدہ آہنگ اور ترنم ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ترنم کے ساتھ آدمی کوئی نئی بات کرے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں روایت نے جو کچھ دیا ہے ہم نے اس کو پوری طرح استعمال نہیں کیا اور ہماری نئی نسل روایت سے بہت دور ہوتی جا رہی ہے۔ روایت میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے اس کو باہر نکالنے کی ضرورت ہے اور وہ سلیقہ پیدا کرنا ہے کہ نئی چیزیں کس طرح بیان کرنی ہیں۔ یہ بڑے شاعر کا کام ہے، یہ کام تو فیض صاحب بھی کر سکتے ہیں۔ شاعرانہ زبان اور روایت کے حوالے سے فیض صاحب کا موقف یہ تھا کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے فارسی کے ساتھ جو ہمارا تعلق تھا اس کو غالب نے تازہ کرنے کی کوشش کی۔ نئے استعارے، نئی تشبیہیں اور نئے طرز بیان سے غالب نے ہمیں روشناس کروایا۔ اس کے بعد انگریزوں کا عہد شروع ہوا انہوں نے کوشش کی کہ لوگ روایت سے انحراف کریں اور ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے شعراء مغرب کی شاعری سے کس حد تک متاثر ہوئے۔

فیض صاحب کہتے ہیں کہ مولانا حالی اور مولانا آزاد روایتی شاعری کر رہے تھے تو اس زمانے میں مغربی شاعری کی کہانی شروع ہوئی۔ ان شعراء نے اپنی شاعری کو چھوڑ کر خالص مغربی تقلید میں شاعری کی ہے۔ نیچرل شاعری اور بیوہ کی فریاد وغیرہ یہ سب فضول چیزیں ہیں۔ جو لوگوں کو اچھی نہیں لگتیں اور یہ شاعری تھوڑے دنوں میں ختم ہوگئی تھی کیونکہ انگریزوں کی تقلید میں شروع کی گئی تھی۔ جب پودے کی جڑ ہی نہ ہو وہ پودا کیسے پروان چڑھے گا۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ یہ جو روایت کی جڑ ہے وہ بھی قائم رہے اور دوسری طرف جو حالات کا تقاضا ہے وہ اس کے مطابق ہونے چاہیں۔

نئی شاعری اور شعراء:

فیض صاحب نئی شاعری اور شعراء کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ سب طرح طرح کے شاعر ہیں کسی کے بارے میں رائے نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ ان میں کچھ اچھے شاعر ہیں اور کچھ برے بھی اور پھر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک نوجوان شاعروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے احتیاط کرنی چاہیے۔ اپنے بارے میں وہ بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شروع میں اپنے شعر خاص دوستوں کو سناتے تھے۔ ان سے داد وصول ہوتی تو مشاعروں میں پڑھتے تھے۔ اگر خود کو کوئی شعر اچھا نہیں لگا یا دوستوں نے اسے نکالنے کو کہا تو اسے کاٹ دیتے تھے۔ وہ اپنا احتساب خود کرتے تھے۔ لیکن فیض صاحب کی بہت سے لوگوں سے قربت رہی۔ بقول فیض صاحب:

''سب سے اول صوفی تبسم اور سب سے آخر بھی صوفی تبسم سے رہی۔''[۱۰۰]

فیض صاحب نے صوفی تبسم صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ ایک تو وہ فیض صاحب کے استاد محترم تھے جن سے فیض صاحب کو بے حد عقیدت اور محبت تھی۔

فیض صاحب نے نوجوان شاعروں کو شاعری کرنے کے لئے تین مشورے دئے۔ پہلا مشورہ یہ کہ جو کچھ بھی لکھو

اپنی مرضی سے لکھو کسی کے دباؤ میں آ کر مت لکھو۔ دوسرا مشورہ یہ کہ انسان کی اپنی ذات تو ایک ادنیٰ سی چیز ہے۔ ذات کے اندر جو کچھ بھی ہے سب باہر سے آتا ہے۔ باہر کی بات کے تین حلقے ہیں ایک تو انسان کی اپنی ذات ہے۔ آپ پر کیا گزری اور جو گزر رہی ہے۔ اس کا آپ کے لوگوں اور آپ قوم پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ آپ کو حالات کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ تین اہم نکات ہیں جن پر آپ کو نظر رکھنے کی ضرورت ہے اور تیسرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔ ماضی سے ہمارا کیسا تعلق تھا حال میں ہم کیا کر رہے ہیں اور مستقبل میں کس راستے پر چلنا ہے۔ ان پر نظر ہونی چاہیے تب جا کر بڑی شاعری وجود میں آتی ہے اور فیض صاحب اپنے متعلق کہتے ہیں کہ جب ہم جیل سے رہا ہو کر گھر گئے تھے اور جو کچھ ہم نے وہاں پر دیکھا اور جو کچھ ہم پر بیتی اسے ہم نے شاعری میں ڈھال دیا۔ فیض صاحب بیان کرتے ہیں۔

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نماز شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی
گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدہ فردا کی گفتگو ہی سہی

شاعری میں تجربات:

فیض صاحب کہتے ہیں کہ جب تک روایات کی بنیاد پر کوئی تجربہ نہیں کیا جائے گا وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ روایات میں صدیوں کے تجربات اور عوام کے مزاج، پسند اور ناپسند کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ پھر روایات سے انحراف ترقی پسندی

کی دلیل نہیں ہے۔علامہ اقبال نے بھی روایات کا دامن پکڑ کر جو تجربات کیے وہ انتہائی کامیاب رہے ہیں۔نثری نظم نے روایات کی کوکھ سے جنم نہیں لیا اس لیے وہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔فیض صاحب نثری نظم کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لکھنے کی کوئی بات ہو، جذبہ ہو اور مفہوم ٹھیک طرح بیان ہو جائے تو وہ نظر بھی آجاتا ہے اور بات بھی سمجھ آجاتی ہے۔فیض صاحب سے ایک انٹرویو میں نثری نظم کے متعلق سوال کیا گیا۔فیض صاحب نے اس کا جواب دیا۔

''ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ نثری نظم کیا ہوتی ہے۔یا تو اسے نثر کہو یا پھر نظم کہو۔نثری نظم تو کوئی چیز نہیں ہے۔مجھے نثری نظم پر اعتراض نہیں ہے اس کے نام پر اختلاف ہے۔''[۱۰۱]

پہلے بھی لوگ شاعرانہ نثر لکھا کرتے تھے وہ اس کو نظم کا نام نہیں دیتے تھے۔فیض صاحب کو اس اصطلاح سے اختلاف تھا۔وزن اور آہنگ سے عاری ذریعہ اظہار کو وہ شاعری کا نام نہیں دیتے تھے۔فیض صاحب کا اپنا ایک مخصوص آہنگ ہے اور وہ لفظوں کی جس طرح تکرار کرتے ہیں اور اپنے انداز سے ان کی پیوند کاری بھی کرتے ہیں۔یہ جاننا ضروری ہے کہ فیض صاحب کس سے متاثر تھے اس کے جواب میں فیض صاحب کہتے ہیں:

''دو باتیں ہیں ایک تو لفظوں کی صوت کا مسئلہ ہے کیونکہ شاعری میں لفظ اور معنی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ہمارے ہاں ایک ہی بڑے شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے صوت کی طرف توجہ کی ہے اور وہ تھے غالب۔۔۔وہ اس معاملے میں بہت ہی صناع ہیں۔الفاظ کی اصوات مرتب کرنے میں انہوں نے بہت ہی مہارت سے کام لیا ہے۔''[۱۰۲]

ہمارے سامنے تو غالب تھے لیکن اس کا سب سے بڑا صناع حافظ ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم کالج میں

پڑھتے تھے ہمیں اپنے دوست خواجہ خورشید انور سے موسیقی کا شوق پیدا ہوا۔اس دوران ہم نے بڑے بڑے اساتذہ کو سنا،استاد برکت علی خان،استاد راشد علی خان اور استاد توکل علی خان۔موسیقی کا شاعری کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ بات ہے کہ آدمی کے کان اتنے حساس ہو جائیں کہ وہ جان لے کہ کوئی لفظ بے سرا تو نہیں ہے،جیسے گانے کا سر ہوتا ہے ویسے شاعری کا بھی سر ہوتا ہے اور گانے میں غلط سر لگ جائے تو آدمی بے سرا ہو جاتا ہے۔ایسے ہی اگر لفظ آجائے اوپر تو توجہ نہیں دی جاتی۔کچھ انگریزی شاعروں کی وجہ سے یہ رنگ ہمارے ہاں پیدا ہوا ہے۔فیض صاحب نے مثال دی جیسے لفظ استعارہ ہے۔اسے ہماری زبان میں متعارف کرایا گیا۔غالب نے فارسی سے رشتہ جوڑ کر جنت نگاہ اور فردوس گوش کہا چونکہ انگریزی میں اس کا کافی ذخیرہ موجود ہے اس لیے ہم نے دیکھا کہ لفظوں کے صرف معنی نہیں ہوتے بلکہ صوت بھی ہوتے ہیں۔ہم نے دونوں کو ملا کر بات کی ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کا انٹرویو لیتے ہوئے ان سے پوچھا کہ آپ نے ہیئت کی بات کی ہے اور ایذرا پاؤنڈ اور ییٹس سے فارم کے سلسلے میں ان سے اثر قبول کیا ہے۔تو فیض صاحب نے جواب دیا ہاں کیا ہے۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ باہر جو ادب ہے اس کا اپنا ایک تسلسل ہے۔انگلینڈ اور یورپ کے ادب کا پس منظر ہمارے ادب سے کافی مختلف ہے۔باہر کے ادب میں جس طرح سے ہیئت،لغت یا ڈکشن میں جو اضافے ہوتے رہتے ہیں اس کی ایک روایت چلی آرہی ہے۔اضافے اس میں داخلی طور پر ہوتے ہیں۔ہمارے نئے لکھنے والوں نے کوشش کی ہے کہ ان کی نقل کریں اور اپنی روایت سے انحراف کریں لیکن ہماری روایت کے ساتھ اس کا کوئی ربط نہیں بنتا۔

فیض صاحب آزاد غزل کے متعلق لکھتے ہیں کہ "آزاد غزل کوئی چیز نہیں ہے" غزل ایک فارم کا نام ہے۔اس میں آزادی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔اگر آپ اس میں آزادی برتیں گے تو یہ کوئی اور چیز بن جائے گی۔مزید فیض صاحب لکھتے ہیں کہ غزل میں بے شمار تجربے ہوئے ہیں اور ہو بھی سکتے ہیں۔غالب اور اقبال نے بھی غزل میں کافی تجربات کیے اور وہ کامیاب بھی رہے۔

فیض احمد فیض کے پسندیدہ شعراء اور رنگ شعر:

فیض صاحب کے پسندیدہ شعرا کی بات کی جائے تو فیض صاحب کو اپنے ہم عصر شاعروں میں ن۔م راشد، مجاز محی الدین اور علی سردار جعفری زیادہ پسند تھے۔ فیض صاحب کی شاعری کی خوبصورتی ان کا مخصوص آہنگ ہے۔ ان کی شاعری میں تکرار ہے جو ان کی پہچان بن گئی ہے۔ فیض صاحب مجاز کی شاعری کے متعلق کہتے ہیں کہ مجاز کی شاعری بہت مختصر ہے۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''آہنگ'' جو چار پانچ سال پر محیط ہے۔ ان کی شاعری پختہ ہونے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ مجاز جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔ علی سردار جعفری تو انقلابی شاعر تھے بعد میں ان کی شاعری میں کافی تبدیلی آئی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کا انٹرویو کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ آپ کس رنگ میں شاعری کرتے ہیں انہوں نے جواب دیا ہمارا جو رنگ ہے اب وہ عام ہو گیا ہے یہ کسی کی ذاتی میراث نہیں ہوتا۔ وقت کے ساتھ جب کسی عہد کو خاص محاورہ یا استعارہ یا کوئی خاص لفظ مل جاتا ہے۔ جس ست شاعر کی کیفیات اس کے مخصوص حالات یا محاورے کا استعمال شاعری میں ہونے لگتا ہے تو پھر ایک مخصوص قسم کی شاعری ہونے لگتی ہے۔ فیض صاحب ایک بڑے شاعر تو تھے ان سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کن شعراء کرام اور اساتذہ سے اثر قبول کیا فیض صاحب کہتے ہیں کہ جس وقت میں نے شاعری شروع کی تو اس وقت اختر شیرانی، حسرت موہانی اور جوش جیسے شاعر چھائے ہوئے تھے حالانکہ اس زمانے میں علامہ اقبال کی شہرت زیادہ تھی۔ جہاں تک فیض صاحب کا تعلق ہے جوانی کا عالم تھا اور ہر طرف رومانوی شاعری ہو رہی تھی۔ فیض صاحب نے بھی رومانوی شاعری کی۔ میری رائے میں فیض صاحب کی شخصیت پر اختر شیرانی، حسرت موہانی اور حفیظ جالندھری کا زیادہ اثر تھا۔ پھر فیض صاحب کو انگریزی ادب کے ساتھ دلچسپی تھی اور کیٹس اور شیلے بھی اس دور میں بڑے مشہور شاعر تھے فیض صاحب نے ان کا اثر بھی قبول کیا۔ فیض صاحب جن شعراء سے براہ راست متاثر ہوئے ان کے متعلق

بیان کرتے ہیں:

''میرے کلاسیک اساتذہ شاعری میں سعدی سے لے کر غالب تک کا نام آتا ہے
اور میرے اپنے معاصرین علامہ اقبال، حسرت موہانی اور اے ایس بخاری ہیں جن
سے میں بے حد متاثر ہوں۔ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن
حسرت اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی شاعری سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔''۱۰۳

ہر انسان کی زندگی میں بہت سے لوگوں کا عمل دخل ہوتا ہے جو ان کو براہ راست متاثر کرتے ہیں۔فیض صاحب کی زندگی میں کئی لوگ اہم رہے ہوں گے جن سے انہوں نے کافی سیکھا ہوگا۔ ہمارے لیے یہ جاننا کافی ضروری ہے۔اس سلسلے میں فیض صاحب کہتے ہیں کہ بزرگوں میں سے جن کے نقش میرے ذہن میں محفوظ ہیں وہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے اور دوسری شخصیت شیخ عبداللہ کی تھی۔قائداعظم سے میری مختصر ملاقات ہوئی۔دوسری اہم بات یہ کہ فیض صاحب کے متعلق یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ انہوں نے غزل کی ہیئت میں نظم کو پروان چڑھایا ہے اور ساری امیجری اور الفاظ کا چناؤ اور اس کا استعمال غزل سے کے کر نظم میں ڈھالا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت اختر شیرانی اور ن -م راشد سے الگ راہ اختیار کرتے ہوئے فیض صاحب نے نظم کی طرف دھیان دیا۔ بقول فیض

''غزل کی امیجری استعمال کر کے ہم سمجھتے تھے کہ اس طرح آسانی سے بات کی جا
سکے گی۔ہم نے دریافت کیا کہ غزل کے جو امکانات ہیں ان سے (سوائے اقبال
کے جو ہمارے لیے اس وقت بھی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے) لوگوں نے صحیح استفادہ
حاصل نہیں کیا۔''۱۰۴

فیض احمد فیض کے بارے میں چند احباب کے خیالات:

فیض صاحب کی شخصیت میں جادوئی اثر ہے کہ ان کے اردگرد ان کے چاہنے والوں اور چاہنے والیوں کی قطار بندھی رہتی ہے۔ میں ذیل میں چند احباب کا ذکر کروں گی جو فیض صاحب سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے رابعہ فخری کا نام آتا ہے۔ جو فیض صاحب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

''فیض صاحب کی بات ہو تو نا جانے کیوں ذہن اس گائے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے سینگ پر گریک میتھالوجی کے مطابق زمین کھڑی ہے۔''[۱۰۵]

مزید بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت میں جادو سا اثر تھا جو اپنی طرف مائل کر لیتا تھا ان کی طرف متوجہ ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آپ کو بولنے پر مجبور کر رہے ہوں اور آپ ان کی شخصیت کو جانچ نہیں سکتے اور اگر تجربہ کرنا چاہیں تو خود بکھر جاتے ہیں پھر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دانتوں سے ان ٹکڑوں کو اکٹھا کر رہے ہوں۔ وہ دانتوں سے مسکراتے ہیں آپ کو کچھ بولنے کچھ کہنے پر ابھارتے ہیں۔

رابعہ فخری فیض صاحب کے بارے میں کہتی ہیں کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ادب میں عجیب قسم کی لے دے ہو رہی تھی۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین پر جوانی کا عالم طاری تھا۔ جوں جوں بحثیں زور پکڑنے لگیں تو شرکاء بھی تعداد میں بڑھتے گئے اس سارے عالم میں فیض صاحب خاموش رہے۔ پھر لوگ باتیں کرنے لگے کہ ہماری لڑائی کروادی خود بھاگ نکلے فیض صاحب نے کہا کہہ ہمیں جو کہنا تھا کہہ دیا اب دوسروں کی باری ہے ان کو بھی بات کرنے کا پورا موقع دیا جائے رابعہ فخری سوچنے لگی کہ یہ کونسا انقلاب ہے۔ اب وہ مزید بات کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ فیض صاحب راولپنڈی سازش کیس میں پکڑے گئے سزا بھی پائی آخر کار رہا ہو کر آئے تو کافی لوگ ان سے ملنے گئے۔ مظہر علی خان، طاہرہ مظہر، عبداللہ ملک، شورش کاشمیری، ظہیر بابر اور نہ جانے کون کون۔ ایک صاحب بولے کہ یہ کیس عدالت میں چل رہا تھا لیکن پھر

بھی لوگوں نے قانون کی مرواہ کیے بغیر لکھا۔اتنے میں شورش کاشمیری بول پڑے فیض کا نام لینے میں پابندی نہیں تھی ۔فیض صاحب مسکرائے اور بولے بھئی پہلے وہ کہتے تھے کہ ہم وطن دشمن ہیں اب کہتے ہیں کہ نہیں ہیں آخر جھگڑا کیا ہے۔ بقول رابعہ فخری:

''اس کے اپنے ذہن میں تو ایام قفس کی تلخی کا کوئی ذائقہ ہی محفوظ نہ تھا۔۔۔یا پھر تلخی

ان کے ضمیر میں تھی ہی نہیں''۱۰۶

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ رابعہ فخری شروع ہی سے فیض صاحب کی طرف دار تھیں ۔اس سلسلے میں فرماتی ہیں کہ فیض صاحب کے چاہنے والوں کی طرح ان کے مخالفین کا حلقہ بھی بہت بڑا تھا۔اور دوستوں سے زیادہ متحرک اور فعال نظر آتا تھا۔ایک دن ان کے پاس جناب الطاف قریشی مدیر اردو ڈائجسٹ آئے ۔میں نے ان سے گفتگو کے دوران فیض صاحب سے اپنی ذہنی وابستگی کا اظہار کیا تو ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے میں نے وجہ پوچھی تو بولے دوسرے یہاں پر بھی موجود ہیں ۔اگلے دن جب وہ آئے تو بتانے لگے میں فیض صاحب سے مل کر آیا ہوں ۔رابعہ فخری نے پوچھا کیوں تو جواب دیا بھئی سوچ غلط تھی ۔وہ تو بہت پیارے انسان ہیں ۔یہ سن کر رابعہ فخری کو بے پناہ خوشی محسوس ہوئی۔

مزید کہتی ہیں کہ پھر ایک دن جب میں اپنی بیمار امیؔ کی دیکھ بھال میں مصروف تھی کہ اچانک نیوز کاسٹر کی آواز میرے کانوں میں گونجی ۔آج فیض صاحب کا انتقال ہو گیا جیسے اچانک زمین میرے پیروں تلے سے سرک گئی ہو اور یوں لگ رہا تھا۔جیسے سب کچھ گڑ بڑ ہو جائے گا۔

مزید رابعہ فخری فیض صاحب کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ فیض صاحب اپنی وفات سے چند گھنٹے پہلے تک استاد دامن کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے جو ان کے لئے روٹی کپڑے اور رہائش کی ذمہ داری لے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی دیکھ بھال بھی کرے۔ پھر ایک دن کیا ہوتا ہے کہ فیض صاحب اس جہان

فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں اور استاد دامن ایک چھوٹے بچے کی طرح دیکھتا رہ گیا۔

رابعہ فخری کہتی ہیں کہ دادا امیر حیدر بھی تو تھے۔ دامن کے ساتھ فیض صاحب کے تعلقات سمجھ میں آتے ہیں لیکن یہ دادا امیر حیدر۔ ایک دن میں نے فیض صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ آپ کی اور دادا امیر حیدر کی دوستی کیسے ہوئی؟ فیض صاحب بولے بھئی دوستی ووستی کچھ نہیں وہ تو ہمارے استاد ہیں۔ مزید فیض صاحب نے کہا:

''ہاں بھئی..... ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جینے کا گر سیکھا۔''[۱۰۷]

اور اگر دادا امیر حیدر سے بات کرو تو وہ کہتا ہے کہ فیض ایک بڑا آدمی ہے اسے صرف ایک ہی فکر ہے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح پنشن دلوا دے تا کہ میں ماہانہ آمدنی حاصل کر سکوں۔ میں نے فیض کو سمجھایا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اگر جیل میں ہوتے ہیں تو حکومت ہماری روٹی کپڑے کی ذمہ داری پوری کر لیتی ہے اور اگر جیل سے باہر ہوتے ہیں تو ہمارے ساتھی ہر چیز مہیا کرتے رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں احمد سلیم لکھتے ہیں کہ ۱۹۷۲-۷۳ء کی بات ہے کہ دادا امیر حیدر مالی طور پر بڑے پریشان تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے ملے تو اپنے سکول کے سلسلے میں مقدمے بازی میں الجھے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد میرے دوست قاضی آفتاب نے مجھے بتایا کہ دادا اکثر و بیشتر فاقے سے دوچار رہتے ہیں اور اس وقت فیض صاحب نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے چیئر مین تھے میں نے ان سے ذکر کیا کہ دادا امیر حیدر مالی طور پر بہت پریشان ہیں تو اس سلسلے میں فیض صاحب نے ان کی مدد کرنے کی ٹھانی کہ انہیں حکومت کی طرف سے وظیفہ دلوا دیا جائے تو امیر حیدر سخت برہم ہوئے کہ میں حکومت سے بھیک مانگوں گا۔

بقول دادا امیر حیدر:

''آپ کتنے سال جیل میں پڑے رہے کیا آپ نے حکومت کے سامنے ہاتھ
پھیلائے؟ اگر آپ اپنی جیب میں سے دوسو روپے مجھے دے دیں تو میں سمجھوں گا
کہ میرے بیٹے نے مجھے دیئے ہیں۔ یہ احمد سلیم دے گا تو میں سمجھوں گا کہ یہ میرا بچہ
ہے لیکن حکومت سے بھیک دلوانے کا آپ نے سوچا کیسے؟''[۱۰۸]

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کافی دنوں کے بعد ہم نے رابعہ فخری سے پوچھا کہ آپ فیض صاحب سے کب، کیسے اور کیوں ملی تھیں؟ وہ بولیں: بی اے کر کے فارغ ہوئی تو جرنلزم میں داخلہ لینے کے لئے یونیورسٹی پہنچی تو پتہ چلا کہ قیوم صاحب ''ہاؤس فل'' کا بورڈ لگا چکے ہیں۔ بہت پریشانی ہوئی پھر میں فیض صاحب کے پاس چلی گئی۔ میں نے چپڑاسی کو بتایا کہ مجھے فیض صاحب سے ملنا ہے تھوڑی دیر بعد فیض صاحب نے مجھے ملنے کے لئے بلوالیا۔ میرے ساتھ میری چھوٹی بہن ثریا بھی تھی۔ فیض صاحب نے ہمیں اندر بلوالیا، وہ ایڈیٹوریل لکھوا رہے تھے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بیٹھنے کو کہا اور پھر جب وہ فارغ ہوئے تو ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھایا، یونیورسٹی پہنچے اور قیوم صاحب کے پاس گئے انہیں کہا کہ بھئی ان کا کام کر دو اور واپس آ گئے۔ قیوم صاحب نے نہ صرف مجھے داخلہ دیا بلکہ ثریا کو بھی داخل کر دیا۔ یہ ان کی فیض صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔

مزید کہتی ہیں کہ جب امتحان پاس کر لیا تو فیض صاحب کے پاس گئی کہ پاکستان ٹائمز میں مجھے نوکری دیں گے۔ مگر فیض صاحب نے مجھے اخبار کی نوکری کرنے سے روک دیا۔ فیض صاحب بولے:

''یہاں رات کو کام کرنا پڑے گا اور تم ماڈل ٹاؤن میں رہتی ہو گاڑی تمہارے پاس
نہیں۔ تمہارے لیے کچھ اور کریں گے۔''[۱۰۹]

کہتی ہیں کہ مجھے ان کی بات بری لگی اور میں واپس اپنے گھر آ گئی انہیں راولپنڈی میں سرکاری ملازمت مل گئی اور وہ فیض صاحب سے ملے بغیر لاہور سے چلی گئیں اور کچھ دنوں بعد فیض صاحب جیل چلے گئے۔ حالانکہ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ بغیر ملے واپس آ گئیں تھیں۔

رابعہ فخری نے اپنی آخری ملاقات کا بتایا جو افسردہ ماحول میں ہوئی۔ کہتی ہیں کہ میں ایک دن لاہور میں کہیں جا رہی تھی کہ زاہدہ خلیق الزمان اور ان کی چھوٹی بہن مریم مل گئیں۔ وہ بولیں فیض صاحب بیمار ہیں اور اسوقت اسپتال میں ہیں ۔چلو ملنے جاتے ہیں، ہم اسپتال پہنچے تو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی مگر زاہدہ کی وجہ سے فیض صاحب سے ملنے کی اجازت مل گئی۔ زاہدہ نے انہیں چھیڑتے ہوئے کہا کہ فیض صاحب یہ تو بڑھاپے کی بیماری ہے آپ نے ابھی سے اختیار کر لی۔ فیض صاحب نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کمزوری کی وجہ سے ان کی مسکراہٹ کہیں گم ہوگئی۔ رابعہ فخری کہتی ہیں کہ میں ان کے سرہانے بیٹھ گئی اور ان کی خیریت پوچھی۔ فیض صاحب نے میرا ہاتھ تھام لیا یا شاید اپنا ہاتھ مجھے تھما دیا۔ میری طرف ایسے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ درد اتنا ہے کہ اب برداشت نہیں ہوتا۔

میری آنکھیں بھیگ گئیں انہیں دیکھا اور پھر نگاہ نیچی کر لی۔ وہ کہتی ہیں کہ آج جب گزرے ہوئے لمحات اور واقعات میری آنکھوں میں ایک ڈائری کی طرح گھوم رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ فیض کے لئے اپنی چاہت اور محبت کو کیا نام دوں۔

پروفیسر سجاد حیدر:

پروفیسر سجاد حیدر فیض صاحب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ میرا تعلق فیض صاحب سے میرے دوست ایوب مرزا کے توسط سے ہوا۔ ایوب مرزا ۱۹۶۴ء میں انگلستان میں سات سال گزارنے کے

بعد پاکستان واپس آئے تھے۔ راولپنڈی میں قیام پذیر ہوئے اور چائلڈ اسپیشلسٹ کے طور پر کافی شہرت پائی تھی۔ لیکن فیض صاحب سے ان کا تعلق انگلستان میں قائم ہوا اور انہیں کے کہنے پر پاکستان لوٹ آئے۔ فیض صاحب پر ایک کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' تحریر کی اور مجھ سے ان کا تعلق ایسا بنا کہ ہر روز ایک ملاقات ضرور ہوتی تھی اور اگر کہیں جانا ہوتا تو دونوں ساتھ جاتے۔

اب پروفیسر سجاد حیدر فیض صاحب سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۷۲ء میں فیض صاحب اسلام آباد میں رہائش پذیر تھے اور پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے چیئرمین تھے اور اکثر ملاقات ان کے گھر پر ہوتی تھی اور ڈاکٹر ایوب مرزا بھی ساتھ ہوتے تھے۔

پروفیسر سجاد حیدر، ڈاکٹر ایوب مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ راولپنڈی پریس کلب میں ایک جلسے کے بعد جب وہ باہر نکلے تو میں نے انہیں باتوں میں لگایا۔ ہمارے ایک دوست فتح محمد ملک نے فیض صاحب پر ایک مضمون ''فیض صاحب کی دو آوازیں'' تھا۔ جو ایک ادبی رسالے میں چھپ چکا تھا۔ تو میں نے انہیں کہا کہ ملک صاحب نے آپ کو رومانوی شاعر کہا ہے۔ تو بولے ہاں ٹھیک ہے ہم کہاں کے انقلابی شاعر ہیں۔ میرا مقصد تھا کہ فیض صاحب غصہ کریں مگر غصہ تو ان کی فطرت میں تھا ہی نہیں اور ملک صاحب نے دوسری بات اپنے مضمون میں یہ لکھی تھی فیض احمد فیض ایک غنائی شاعر ہیں۔ اب پتہ نہیں کہ ملک صاحب کے نزدیک یہ خوبی تھی یا برائی اس کے جواب میں فیض صاحب بولے۔

''علامہ اقبال کے ہاں جو موسیقیت ہے وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تک انقلابی شاعر ہونے کا تعلق ہے تو وہ حبیب جالب ہے۔''[۱۱۰]

مزید پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے اپنے آپ کو موازنے سے بچالیا کیونکہ وہ زندگی کا سفر یقین کے ساتھ پرسکون ماحول میں طے کر رہے تھے۔ کیونکہ انہیں لینن امن ایوارڈ بھی مل چکا تھا اور وہ مقام، مرتبے، شخصیت اور

شاعری کے بارے میں واضح تھے کیونکہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں ان کی زندگی میں ہی بے شمار عزت اور شہرت دی گئی۔ اور پھر حکومت کے لئے ایسے شخص کو اپنے عہدے سے فارغ کرنا ایک مشکل کام اور توہین بھی تھی لیکن ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ کیونکہ فیض صاحب جیسا شخص ان کے ہر جائز اور ناجائز کام میں ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کے وزیر ثقافت عبدالحفیظ پیرزادہ نے نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا آئین مرتب کیا جس میں وزیر ثقافت بلحاظ عہدہ چیئرمین قرار دیا۔ جس کے اندر کونسل کا سربراہ ڈائیریکٹر جنرل ہوگا اور پھر فیض صاحب کے ڈائیریکٹر جنرل کا عہدہ ٹھیک نہیں تھا اور انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔

مزید وہ بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ایوب مرزا کے کہنے پر فیض صاحب نے میرا نام ڈائیریکٹر کی حیثیت سے حکومت کو بھیج دیا تھا اور میں بھی خوش تھا کہ فیض صاحب کی موجودگی میں کام کروں گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جب حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے مجھے کونسل میں کام کرنے کی اجازت دی تو فیض صاحب کونسل کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔

۱۹۷۶ء میں فیض صاحب کی ۶۵ ویں سالگرہ کی تقریبات کی ابتدا ایجوکیٹرز کلب راولپنڈی سے ہوا اور فیض صاحب نے ایوب مرزا کو کچھ پڑھنے کو کہا اور پھر ایوب مرزا نے مجھ سے مدد لی کہ کیا پڑھوں اور میں نے اسے فیض صاحب سے کچھ محفلوں کا حال احوال بیان کرنے کو کہا۔ جبکہ ایوب مرزا اپنے بیان کی سادگی سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے میرے اور اپنے دوست یونس منصور کو اپنا مضمون دکھایا۔ یونس منصور اس وقت ٹی وی اسکرپٹ ایڈیٹر تھے۔ جبکہ انہوں نے ایوب مرزا کے مضمون کو فارسی کی طرز پر اردو میں تبدیل ہوتے دیکھا تو پریشان ہو گئے اور اپنا مضمون واپس لے آئے اور تقریب میں اسے طریقے سے پڑھ کر سنا دیا۔ فیض صاحب نے بے حد پسند کیا اور بعد میں یہی مضمون لاہور کی تقریب میں پڑھنے کو کہا اور جب ایوب مرزا لاہور پہنچے شام فلیٹیز (ہوٹل) چلے گئے۔ وہاں جلسہ ہو رہا تھا۔ اختر الرحمن (آئی۔ اے رحمن) اسٹیج سیکرٹری تھے۔ اور کشور ناہید بار بار آ کر بتاتیں کہ ڈاکٹر تمہاری باری آنے والی ہے اور جلسہ ختم ہو گیا اور ایوب مرزا کو نہیں بلایا گیا ہمیں

یہ بات سمجھ نہیں آسکی۔ پھر ایوب مرزا اس واقعے سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فیض صاحب کے ساتھ اپنی تمام محفلوں کی داستان مکمل کر کے ہی دم لیا۔ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کا مسودہ فیض صاحب نے دیکھا اور پسند بھی کیا کہ یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ فیض صاحب کی ۶۵ ویں سالگرہ لاہور کے علاوہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں بھی منائی گئی۔ اس سلسلے میں احمد سلیم لکھتے ہیں جن کو فیض صاحب کا قرب بھی حاصل تھا جو ایک ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ان کے قریب تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> ''میں ان دنوں سندھ یونیورسٹی جامشورو میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کا پنجابی ترجمہ کر رہا تھا اس کام کے سلسلے میں فیض صاحب نے ہی عظیم سندھی شاعر اور اس وقت کے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایاز شیخ کے پاس بھیجا تھا۔ پارٹی کے ایماء پر میں بھی فیض صاحب کی سالگرہ میں شرکت کے لئے لائل پور پہنچ گیا جہاں میں نے پنجابی میں اپنا مقالہ "فیض، رسول حمزہ توف تے ماں بولی "پڑھا۔ اس پر داد کے ساتھ بیداد بھی ملی ''[۱۱۱]

پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ایک سہ رکنی وفد سویت یونین بھیجا گیا۔ اس سرکاری وفد میں میرے ساتھ کراچی کے عرفان حسین اور وزارت ثقافت کے مختار احمد تھے۔ ماسکو پہنچ کر ہماری سرکاری مصروفیت یہ تھی کہ ہمیں پاکستان کے سفیر کی خدمت میں سلام پہنچانا تھا۔ تو اسی وقت فیض صاحب بھی تشریف لائے تھے وہ ہمیں دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہم یہاں کیسے آ گئے اور بعد میں جب فیض صاحب سے بات چیت ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ ایوب مرزا نے ہم کہ ٹھہرے اجنبی کی چند جلدیں ہمارے ہاتھ بھجوائیں کہ نہیں۔ پروفیسر سجاد حیدر کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا جب میں واپس راولپنڈی پہنچا تو ڈاکٹر ایوب مرزا نے بتایا کہ وہ کتاب کی کچھ جلدیں لے کر ہوائی اڈے پہنچے مگر ہم لوگ جہاز میں

سوار ہو چکے تھے۔

پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ فیض صاحب اس کتاب کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کرانا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی شاعری کو بڑے پیمانے پر تسلیم کیا جائے اور ماسکو سے ان کا لگاؤ شاید اس طرح کی شہرت حاصل کرنے میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ ایک بار میں نے روس کی پالیسیوں کو تنقید کی نظر سے دیکھتے ہوئے ان سے پوچھ لیا کہ وہ اب بھی روس کے حق میں بات کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ روس کی پالیسیوں کے حق میں نہیں ہیں بلکہ روس سے وابستگی ختم نہیں کر سکتے۔ تو پروفیسر صاحب نے پوچھا کیوں تو وہ بولے:

"بھئی یہ تو ہماری جوانی کا رومانس ہے۔"

مزید پروفیسر لکھتے ہیں وہ سیاسی طور پر کسی پارٹی سے منسلک نہیں تھے۔ فلسفیانہ سطح پر سوشلزم کی طرف رجحان تھا ان کی شاعری ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز بن کر ابھرتی رہی اس احتجاج میں غزل کا رنگ اور روایتی شاعری کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ قاری اس سے بور نہیں ہوتا۔ وہ محظوظ ہوتا رہتا ہے۔ فیض صاحب نے یہ کام بھی کیا کہ شاعری اور لوگوں کو ایک نئی زبان اور لہجے سے واقف کار بنا دیا بلکہ انہوں نے روایت کو مضبوط کر دیا۔ ۱۹۷۸ء کے انتخابات ہوئے سیاسی جماعتوں کی مخالفت ابھرنے لگی۔ بھٹو کی حکومت کے خلاف تحریک شروع ہو گئی۔ پروفیسر لکھتے ہیں کہ انہوں نے تمام عمر مخالفوں کا سامنا کیا اور امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ انتخابات کے موقع پر ایک نظم کہی جس کے آخر میں چار شعر یہ تھے۔

ہم کہ ہیں کب سے در امید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دست طلب پھیلائیں گے
کوچہ و بازار سے پھر چن کر ریزہ ریزہ خواب
ہم یونہی پہلے کی صورت جوڑے لگ جائیں گے

پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ اتنی کٹھن مشکلات کے باوجود وہ خوش نصیب تھے کہ انہیں زندگی میں عزت و مرتبہ کے ساتھ آرام سکون کی زندگی۔ وہ ۱۹۸۴ء میں افغانستان میں روس کی آمد سے مطمئن نہیں تھے تو ۱۹۸۹ء کے وہ دن بھی دیکھنے کو ملے سویت یونین کو شکست ہوئی اور ماسکو کے لیڈر امریکہ سے بھیک مانگنے لگے۔

سید سجاد ظہیر:

سید سجاد ظہیر اور سابق میجر محمد اسحاق کے خیالات اور تاثرات اگرچہ زندان نامہ میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی اہمیت کی وجہ سے ان کو دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ سید سجاد ظہیر اپنے مضمون ''سرآغاز'' میں لکھتے ہیں۔

مقدمہ ''سازش'' راولپنڈی کے دنوں میں بھی فیض صاحب کے ساتھ سنٹرل جیل (حیدر آباد سندھ) میں تھا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء تک ہمارے مقدمے کی سماعت بھی ختم ہو چکی تھی اور ہمیں روز اسپیشل ٹریبونل کے اجلاس جا کر ملزموں کی طرح گھنٹوں بیٹھے رہنے اور گواہوں کی شہادتوں اور وکیلوں کی جرح سے ہماری جان چھوٹ گئی تھی اس پر ان کی بحث اور قیاس آرائیوں سے بھی نجات مل گئی تھی کہ صبح سماعت کی بنیاد پر کیا فیصلہ دیتے ہیں ان سب چیزوں سے ہم آزاد ہو گئے تھے اور ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا اور ہم شش و پنج میں مبتلا تھے۔ ایک دن ہمیں اطلاع ملی کہ ''دست صبا'' چھپ گئی ہے۔ حالانکہ اس مجموعے کی ساری شاعری فیض صاحب سے سن چکے تھے۔ لیکن اس خبر سے ان قیدیوں کو بہت خوشی ہوئی جو ادب سے لگاؤ رکھتے تھے۔ ہم نے جیل کے حکام سے اجازت طلب کر کے ایک پارٹی کی اور فیض صاحب کو سب قیدیوں نے ''دست صبا'' کی اشاعت پر مبارک باد دی۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ اس موقع پر باقی باتوں کے علاوہ میں نے یہ بات کی تھی کہ بہت سا وقت گزر جانے کے بعد جب لوگ راولپنڈی سازش کیس کو فراموش کر چکے ہوں گے اور جب پاکستان کا مورخ پاکستان کی ۱۹۵۲ء کی تاریخی واقعات پر نظر دوڑائے گا تو اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کو ٹھہرایا

جائے گا۔

سید سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ ''زندان نامہ'' کی بہت ساری منظومات فیض نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران تحریر کیں۔یعنی جولائی ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کی ساری چیزیں اس میں موجود ہیں۔کیونکہ اس دوران ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ہم دونوں کو چار چار سال کی قید با مشقت کی سزا دینے کے بعد اہل ارباب نے فیصلہ دیا کہ اب ہمیں مختلف جیلوں میں منتقل کیا جائے۔فیض کو پنجاب میں منٹگمری جیل میں بھیجا گیا اور مجھے حیدر آباد سندھ سے بلوچستان کی سنٹرل جیل مچھ۔ہمیں ایک دوسرے سے براہ راست خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔تا ہم دوسروں کے خطوط کے ذریعے اور اردو کے کچھ رسائل کے ذریعے مجھے فیض صاحب کی کچھ نظمیں پڑھنے کو مل گئیں جو اس وقت تحریر کی گئیں تھیں۔

مزید لکھتے ہیں کہ اب جب میرے حالات زندگی کافی پرسکون ہیں۔آزاد ماحول میں سانس لے سکتا ہوں اور جب میں اپنی ذہنی جذباتی صورت حال اور روحانی کیفیات کے بارے میں سوچتا ہوں جو اس وقت جیل میں مجھ پر حاوی ہوئیں تھیں۔جب اپنے پسندیدہ شاعر اور ساتھی قیدی کا کلام پڑھتا تھا تو اس کا اظہار کرنا مجھے مشکل لگ رہا ہے۔مزید وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے کہ ہمارے بہت سے تجربے،زندگی اور اپنے وطن کو شمبار اور حسین بنانے کے متعلق ہیں اور ہمارے خواب ہمارا درد،ہماری نفرتیں اور رغبتیں مشترک تھیں۔میں فیض صاحب کے ان اشعار سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا تھا اور اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو فیاضی سے مرصع کر دیتا ہے اور اپنی نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیتا ہے۔

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ فیض کی نظموں کو اگ مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ اگر ہم اقدار کی بات کریں۔جنہیں شاعر نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے اور وہ اقدار وہیں ہیں جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی

ہیں۔ بلکہ ان کو اس کاری گری سے ہٹایا ہے۔ وہ نہ تو ہماری تہذیب وتمدن کی روایت ہے نہ ہی شاعر کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

اس کا مترنم انداز کلام اور شیریں کہیں نہیں ان سے الگ نہیں ہوتا ہے اور ان کے متحرک اشعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی مہک ہے۔ ان کے خیالات اور سوچ میں ان سچائیوں اور جمہوری مقاصد کی چمک دمک ہے جن سے ہماری قوم کی اکثریت کے دل روشن ہیں۔ فیض صاحب کے تمام چاہنے والے نقش فریادی دست صبا اور زندان نامہ کو پسند کرتے ہوئے ان سے یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ کیفیتی لحاظ سے ان کی وہ جو تخلیقیں ابھی سامنے نہیں آئیں مزید خوبصورت اور مترنم ہوں گی۔ اس کے مقابلے میں جو وہ پہلے لکھ چکے ہیں۔

سابق میجر محمد اسحاق:

میجر محمد اسحاق نے ''زندان نامہ'' کا دیباچہ لکھتے ہوئے روداد قفس کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ انہوں نے تفصیل سے فیض صاحب کے اس دور کی شاعری کی تخلیقی وجوہات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب فیض صاحب کو چار سال کی سزا ہوگئی۔ تو تمام قیدیوں کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر ملک کی مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ ان دنوں میجر اسحاق کو بھی فیض صاحب کے ساتھ کافی وقت گزارنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

میجر صاحب لکھتے ہیں کہ حیدر آباد جیل میں دوران مقدمہ کے دن بڑے عجیب تھے۔ اس کے بعد حیدر آباد میں سزا ملنے کے بعد اگلی منزل لاہور جیل ہے۔ ہم سب کو دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ وہاں پر ''بم کیس وارڈ'' میں رکھا گیا۔ یہاں پر بھی سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ مزید بتاتے ہیں کہ حید ر آباد میں میں فیض صاحب اور عطا آمنے سامنے کے کمروں میں رہتے تھے اور ہم سب ایک دوسرے کے موڈ سے اچھی طرح واقف

ہو گئے تھے۔ جب فیض صاحب پر شعر کا عالم طاری ہوتا تھا تو وہ خاموش ہو جاتے تھے اور ہم سمجھ جاتے تھے کہ انہیں سامعین کی ضرورت ہے اور مناسب موقع تلاش کر کے ان کے پاس پہنچ جاتے تھے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد غزل یا نظم سنانے کا مطالبہ کر دیتے اگر نظم یا غزل تیار ہوتی تو ایک آدھ شعر سنا دیتے ورنہ حکم لگا دیتے کہ بھاگ جاؤ اور فوراً سمجھ جاتے تھے کہ انکار میں اقرار چھپا ہوا ہے۔

مزید لکھتے ہیں کہ حیدر آباد میں تقریباً ہر پندرھواڑے ایک مجلس مشاعرہ منعقد کرنے کا رواج طے پا گیا تھا۔ یہ مشاعرہ کبھی طرحی اور کبھی غیر طرحی اور سب کو اس میں حصہ لینا ہوتا تھا۔ دست صبا میں مندرجہ ذیل مصرعوں پر کہی غزلیں موجود ہیں۔ فیض کی غزل "وہیں ہے دل کے فرائن تمام کہتے ہیں"۔ حسرت موہانی کی ایک غزل پر کہی گئی ہے۔ میجر اسحاق لکھتے ہیں کہ میرے خیال میں فیض صاحب کی شاعری کے چار رنگ ہیں۔ پہلا رنگ سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں ان کی تین مہینوں کی قید تنہائی کا ہے۔ وہ بڑے سخت دن تھے کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار اور خطوط سب چیزوں پر پابندی تھی۔ انہوں نے اس بات کا حوالہ بھی دیا ہے،

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے
زبا ں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

فیض صاحب کہتے ہیں کہ ان دنوں ان کی طبیعت میں زوروں کی آمد بھی تھی اور طرح طرح کے مضامین دماغ میں آ رہے تھے اور اس دور کا کچھ کلام تو ان کے ذہن سے اتر گیا تھا اور جو بچ گیا تھا وہ دست صبا میں شامل ہے۔

میجر اسحاق لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کی شاعری کا دوسرا رنگ حیدر آباد جیل کا ہے اور یہاں پر ہمیں ہر طرح کا

سکون میسر تھا جو جیل میں ممکن ہوسکتا ہے۔

پھر حشر کے سامان ہوئے ایوان ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل ، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرم وفا دیکھیے کس کس پہ ہو ثابت
وہ سارے خطا کار سردار کھڑے ہیں

میجر اسحاق لکھتے ہیں کہ "دست صبا" کے دوسرے حصے میں فیض کی تخلیق کا جذبہ تھوڑا کم ہوگیا تھا۔اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کچھ عرصہ مقدمہ کی سماعت ہو جانے کے بعد ہمیں امید کی کرن نظر آرہی تھی کہ اگر ہم عدالت کی کاروائی میں کچھ دلچسپی لیتے تو بہتری کی صورت نکل آتی اور دوسری وجہ ان کے بھائی کی اچانک موت تھی۔ وہ حیدر آباد فیض صاحب سے ملنے آتے تھے ۔۱۸ جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح کی نماز پڑھتے وقت ان کی وفات ہوگئی۔ اپنے بھائی کی موت نے فیض صاحب پر بہت اثر ڈالا۔

میجر اسحاق لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کی شاعری کا تیسرا رنگ کراچی کا ہے۔یہ رنگ دوسرے اور چوتھے رنگ کا درمیانی حصہ ہے۔اصل میں یہاں فیض صاحب اپنے علاج کے لئے آئے تھے اور تھوڑے آزاد بھی تھے، کیونکہ انہیں جیل میں آزادی جیسی نعمت کی کمی محسوس ہوتی تھی اور جب وہ واپس منٹگمری جیل آئے تو ان سے قید برداشت بھی نہیں ہوتی تھی اور شاعری میں بھی ظاہر ہونے لگا تھا۔انہوں نے کراچی اور منٹگمری میں تحریر کی ہوئی غزلوں اور نظموں کے مجموعے کا نام ''زنداں نامہ'' رکھا۔

فیض صاحب کی شاعری کا چوتھا رنگ منٹگمری جیل کا ہے یہاں پر انہیں حیدر آباد جیسی سہولتیں ملی ہوئی تھیں ۔منٹگمری میں فیض صاحب کو اپنی فیلی اور دوسرے لوگوں سے ملاقات بھی میسر آجاتی تھی۔لیکن انہیں

ان سب کے باوجود منٹگمری جیل میں قیدی ہونے کا احساس رہتا تھا حیدر آباد میں انہیں دوستوں کا قرب حاصل تھا اورشاید دوسری وجہ کراچی میں انہیں آزادی حاصل تھی اور پھر انہیں مستقبل میں رہا ہوجانے کی امید تھی وہ بھی الجھ گئی ان کی شاعری میں قید تنہائی کا رنگ غالب آ گیا ۔ان کی شاعری میں انہیں ہر چیز سے خوف آتا تھا ۔ پہلے باہر کی دنیا کے ساتھ تخیل کا بلا واسطہ تعلق تھا ۔اب اسے بھی جیل کی دیواریں پھلانگ کر اندر آنا پڑتا تھا۔

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں
ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے
اشکوں سے منور جاتی ہے

میجر اسحاق لکھتے ہیں کہ حیدر آباد کے قیام کے دوران فیض کا باہر کی دنیا کے ساتھ تصوراتی تعلق جما دیا تھا۔ بلکہ جیل کی زندگی نے اسے اور بھی مضبوط بنا دیا تھا۔''دست صبا'' کے آخر میں دوخوبصورت نظمیں ''زنداں کی ایک شام'' اور''زنداں کی ایک صبح ''ہیں۔لیکن منٹگمری جیل میں قید بڑی بھیانک معلوم ہوتی تھی ۔جیل میں انہیں دنیا بھر کے مظلوموں اور قیدیوں کا دکھ اپنا دکھ معلوم ہوتا تھا ۔کینیا کے لوگوں پر جمہوریت اور آزادی کے لٹیروں نے ظلم وستم ڈھائے اور اپنے ملک کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔تو فیض صاحب بڑے پریشان رہتے تھے اور انہوں نے افریقی عورتوں کے کارناموں سے متاثر ہو کر نظم لکھی ''آجاؤ افریقہ''اور ان کی دوسری نظم ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' ہے۔انہوں نے روزن برگ جوڑے کی عظیم قربانی سے متاثر ہوکر لکھی تھی۔اس مجموعہ کلام کی بے انتہا مقبول اور فنی اعتبار سے بہت دلکش نظمیں ہیں۔اس نظم کے متعلق میجر اسحاق لکھتے ہیں:

''یہ نظم کربلا، پلاسی، سرنگاپٹم، مدکی، جھانسی، جلیان والا باغ، قصہ خوانی، سٹالن گراڈ، ملایا، کینیا، کوریا، تلنگانہ، مراکش اور طیونس سبھی سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور طہران، کراچی اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر دم توڑتے طلبہ، مراکش، طیونس، کینیا اور ملایا کے خون میں لت پت مجاہد، سب ایک ہی جانفروز نعرہ دہراتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔''[۱۱۲]

تیرے کوچے سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

میجر اسحاق لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت ہے۔ جیل میں بھی اپنے وطن کی محبت میں تڑپتے رہتے ہیں اور انہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ جب تک آزادی وطن کے لئے فرزندان وطن اور اعلیٰ انسانی معاشرے کے لئے انقلاب کی شمع دل میں روشن کئے ہوئے جیالے جدوجہد پر آمادہ رہیں گے اور آزادی کی منزل قریب آتی جائے گی۔

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہی سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہو گی

میجر اسحاق مزید لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے وطن کی محبت میں اپنے آپ کو اس قدر سمو دیا تھا کہ اب ہم اس کو ان کی دوسری محبتوں سے جدا نہیں کر سکتے۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو

تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

میجر محمد اسحاق لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۱ء میں جب ہندوستان کی پاکستان پر جارحانہ حملے کی خبریں گردش کرنے لگیں تو ہم میں سے کچھ افسران جو ابھی ملازمت سے برطرف نہیں ہوئے تھے کہ پاکستان کی حفاظت کے لئے ہمیں بھی لڑنے کی اجازت دی جائے۔ خاص طور پر جب ہمیں کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے لڑنے کا تجربہ بھی حاصل ہے۔ ہمیں مقدمے سے جان نہیں چھڑانی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہندوستانی فوج کے ساتھ ہندو سبھائی وراکا پی درندے بھی ہوں گے اور مغربی پاکستان سے فرار نہیں چاہتے تھے لیکن ہماری درخواست مسترد کر دی گئی۔ زمانہ کھرے کھوٹے کی خود ہی تمیز کرے گا۔

نظیری کاش بنمائی کہ ور ساغر چہ مے داری

کہ پیش زاہداں قدر گنہگاراں شود پیدا

مزید لکھتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کا ذکر ہو رہا ہے۔ فیض صاحب بھی جیل میں اکثر اپنے ہندوستانی دوستوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ ان میں کئی تو لاہور کے رہنے والے تھے۔ مولانا حسرت موہانی، رشید جہاں، صاحبزادہ محمود الظف، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، پنڈت ہری چند اختر، اپندر ناتھ اشک، اور ان کی بیگم، ملک راج آنند، کرشن چندر، ڈاکٹر اشرف، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھ پوری۔ وہ کہتے ہیں کہ ان اصحاب کا ذکر اتنی بار سنا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کے ساتھ جان پہچان ہو۔ حالانکہ میں ان سے ذاتی طور پر ملا ہی نہیں۔ اور پھر میجر اسحاق لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کا دور فیض صاحب نے لاہور میں گزارا تھا۔ اس دوران وہ مشرقی پنجاب سے بھی ہو آئے تھے۔ جس

طرح انسانیت کی تذلیل کی جارہی تھی اتنے بڑے سانحہ کو وہ شاعری میں بھی بیان نہیں کر سکے۔ ہوسکتا ہے وہ ناول یا ڈرامے سے اس سانحہ کو بیان کرسکیں۔ پنجاب کی سرزمین تو ہزاروں سالوں سے حملہ آوروں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جس طرح پنجابیوں نے پنجابیوں کو ذلت آمیز شکست دی شاید دوسرے حملہ آوروں نے مل کر نہیں دی ہوگی۔ امرتا پریتم کے الفاظ میں:

اج آکھاں وارث شاہ نوں کنوں قبراں وچوں بول

تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول

اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وَین

اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ توں کن

فیض صاحب پاکستان میں کچھ لوگوں کے اس نظریے سے متفق نہیں تھے کہ ہر وہ شئے جو پاکستان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ پاکستان کے لئے زہر ہے ریڈیو پر سوائے اقبال کے کلام اور فلمی گانوں کے کچھ سننے کو نہیں آتا تھا اور وہ کہتے ہیں کہ ہم جیل والوں سے چھپ کر ہندوستانی ریڈیو اسٹیشنوں سے اپنے دیس کے راگ سنا کرتے تھے۔ کسی جاہل نے جوش میں آکر امیر خسرو، تان سین، واجد علی شاہ، عبدالکریم خان، فیض خاں اور دوسرے بڑے لیڈروں اور اساتذہ سے پاکستان کا رشتہ توڑنے کو حب الوطنی قرار دے دیا۔

میجر اسحاق لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کی شاعری میں دلی جوش و جذبہ ہے۔ اس میں قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔ لیکن شاید کیا بات کہ اس کے اقوام میں پاکستان کے محنت کشوں کا مبارک پسینہ اور خون کی حرارت ابھی تک پوری طرح شامل نہیں ہیں۔ سمن و گلاب کو جس چاہت سے یاد کیا ہے اسی چاہت اور تفصیل سے اس بدحال اور بدنصیب کا ذکر نہیں ہے۔ جس نے سمن اور گلاب کو اپنے خون جگر سے سینچ کر شاداب کیا ہے اور جس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی ان سمن و گلاب کی

نزاکتوں، رنگ وروپ اور عطر بیزیوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری کو ابھی آگے بڑھنا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن اور فیض احمد فیض:

ڈاکٹر محمد حسن کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ فیض صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۴ء میں لکھنو میں ہوئی جب میں بی اے فائنل یا ایم -اے سال اول کا طالب علم تھا۔ فوجی وردی میں ملبوس فیض صاحب یونی ورسٹی کے برآمدے میں احتشام حسین صاحب کا پتہ پوچھتے ہوئے پائے گئے اور اس وقت سبھی اردو داں فیض صاحب کی نظمیں ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ''، ''رقیب سے''، ''میرے ہمدم میرے دوست''، گنگنا رہے تھے مگر میں حیران تھا کہ ایک خاموش قسم کا فوجی ان کا مصنف ہو سکتا ہے۔ پھر جیسے فیض صاحب کہیں کھو سے گئے شاید ملک کے حالات نے کافی کروٹیں بدلیں۔ معلوم ہوا کہ فیض صاحب راولپنڈی مقدمہ سازش کیس میں قید ہو کر جیل چلے گئے لیکن یہ جیل میں بھی خاموش نہیں رہے ان کی فکری سوچ اور ان کی صدائیں صبا کے ہاتھ باہر آنے لگیں۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ فیض صاحب مجلسوں اور بے تکلف صحبتوں کے انسان تھے۔ ان کا دل محبتوں اور یکجائی کے نغموں سے بھرا ہوا تھا۔ بقول ڈاکٹر حسن:

> ''وہ بولتے کم تھے مگر دوستوں کی محفل میں چہکتے تھے اور خوش دلی اور آسودگی کو جذب کرتے تھے۔''[۳۱۱]

ان کا دل ہمیشہ غنی اور آسودہ رہا اور ان پر مصیبتیں بھی بہت آئیں مگر خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ جنرل ضیاء کی حکومت وجود میں آئی میں نے فیض صاحب سے آرٹ کونسل لاہور کے دفتر میں ملاقات کی تو فیض صاحب کا صبر وتحمل اور ان کا سکون اور دل موہ لینے والی مسکراہٹ اور ان کی شخصیت کا ٹھہراؤ سب

کچھ پہلے جیسا تھا۔مگر یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی مشکل صورت حال سے گزر رہے ہیں جسے وہ خندہ پیشانی سے برداشت کررہے ہیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد حسن جواہرلعل یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔جواہرلعل یونیورسٹی ان دنوں فیض صاحب کو آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور ہم لوگوں کی خواہش بھی تھی کہ فیض صاحب کچھ سالوں کے لئے پروفیسر کے طور پر جواہرلعل یونیورسٹی میں آجائیں اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ان سب تجاویز کو منظور کرلیا تھا اور فیض صاحب نے وقتی طور پر دلی آنے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر فیض صاحب دلی تشریف لے آئے اب یونیورسٹی دونوں کاموں کے لئے راضی تھی آنریری ڈاکٹریٹ کے لئے اور وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ترقی کے لئے اس تقرر کے لئے فیض صاحب نے یونیورسٹی میں انگریزی میں دو خطبات دیئے۔ میں فیض صاحب سے ملنے گیا وہ کرنل سندھو کے پاس ٹھرے ہوئے تھے کہنے لگے:

> ''بھئی ہماری حکومت سے بھی پوچھ لو۔کوئی اور ملک ہوتا تو کوئی بات نہ تھی ہندوستان کا معاملہ ذرا پیچیدہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے تعلقات کا کوئی بھروسہ نہیں۔''[۱۱۴]

مزید لکھتے ہیں کہ رات کو پاکستانی ہائی کمشنر عبدالستار کے ہاں فیض صاحب کی دعوت تھی۔اس میں بھی یہی معاملہ زیر بحث رہا۔ دوسرے دن میں نے حکومت ہند کی وزارت خارجہ اور وازرت تعلیم دونوں کو لکھ بھیجا۔ چند ماہ بعد اس دور کے وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی پاکستان جانے والے تھے۔ان سے بھی کہلوایا مگر وزارت تعلیم کا فوراً جواب موصول ہوگیا کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے جبکہ فیض صاحب وہاں چند ہفتے رہنے کے بعد چلے گئے تھے۔لیکن وزارت خارجہ نے جواب دینے میں بڑی تاخیر کردی کئی ماہ بعد جواب ملا۔

آخر کار یہ قصہ یہیں ختم ہو گیا۔ لیکن اس وقت میں فیض صاحب سے بار بار ملنے اور مختلف معاملات پر تبادلہ خیال کرنے کا موقعہ ملتا رہا۔ ملکوں ملکوں میں ان کی ضرورت تھی ہندوستان کے ہر صوبے میں ان کے پرستار موجود تھے بلکہ پنجاب اور ہریانہ کی حکومتوں نے انہیں سرکاری دورے پر مدعو کیا اور حکومتوں کی طرف سے ان کے اعزاز میں جلسے بھی ہوئے۔ فیض صاحب ہوائی جہاز سے کبھی بمبئی جاتے، کبھی حیدر آباد، کبھی جے پور، تو کبھی بھوپال۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ میں ان دنوں اتر پردیش اردو اکاڈمی کا چیئر مین تھا لکھنو میں فیض صاحب کے اعزاز میں جلسہ ہونا تھا، انہوں نے میرے ساتھ لکھنو جانا تھا۔ ہم لوگوں نے ہوائی جہاز کے ذریعے صبح سات بجے روانہ ہونا تھا۔ اب فیض صاحب بمبئی سے دہلی واپس ہی نہیں آئے ڈر تھا کہ لکھنو میں کیا ہوگا۔ جلسہ تو صرف فیض صاحب کے لئے منعقد ہو رہا تھا اور وزیر اعلیٰ نے ان کو ویلکم کہنا تھا ۔ میں اپنے خیالوں میں گم تھا نظر اٹھا کر دیکھا تو فیض صاحب ہوائی اڈے کے برآمدے سے مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ بولے:

بھئی بمبئی کی فلائٹ ابھی آئی ہے ذرا دیر ہو گئی۔

لکھنو کے جلسے میں ایک صاحب نے فیض صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ فیض صاحب کی شاعری نظریے سے بلند ہے اور یہ مکتبہ فکر کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ پھر فیض صاحب نے اس بیان کو رد کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا:

''میری شاعری جو کچھ ہے اسی نظریے کی دین ہے۔ جو اسی شہر میں ۱۹۳۶ میں منعقد ہونے والی ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنسوں سے مجھے حاصل ہوا تھا۔''[۱۱۵]

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کو کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر کی پیشکش ہوئی تھی مگر فیض صاحب بیروت چلے گئے تھے۔ جہاں انہیں لوٹس کے مدیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ فیض صاحب کی سالگرہ

کی تقاریب شان وشوکت سے منائی گئی۔سترھویں سالگرہ کا جشن پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی منایا گیا۔دہلی میں ایک استقبالیہ دیا گیا جس کے لئے کمیٹی جناب اندر کمار گجرال کی سرکردگی میں بنی۔ایک بڑا جلسہ سپرو ہاؤس میں ہوا۔اس جلسے میں ''چار یار'' خاص طور پر فیض صاحب سے مختلف سوالات کرنے کے لئے بلائے گئے تھے۔امرتا پریتم،خشونت سنگھ، کملیشور اور ڈاکٹر محمد حسن بھی تھے۔خشونت سنگھ نے فیض صاحب سے پوچھا آپ کا خدا کے بارے میں کیا تصور ہے۔تو انہوں نے جواب دیا وہی جو مولانا روم کا ہے۔پھر مثنوی کا ایک شعر سنایا جس سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ خدا انسان کے اندر موجود ہے۔ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ میں نے فیض صاحب سے دو سوال پوچھے۔پہلا سوال کہ جیل کی زندگی کا ان کی شعری احساس پر کیا اثر ہوا؟انہوں نے جواب دیا:

جیل کا اثر انسانی رویے،سوچ پر وہی ہوتا ہے جو پہلی مرتبہ عشق کرنے کا ہوتا ہے۔ہر تجربہ نیا ہوتا ہے اور ہر شئے انوکھی نظر آتی ہے۔دوسرا سوال یہ تھا کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا تکلیف دہ حادثہ کونسا تھا تو انہوں نے جواب دیا ان کے بڑے بھائی (طفیل احمد خاں) کی موت تھی۔جو اتنی دور سے سفر کر کے آئے اور نماز کے دوران ان کی موت ہوگئی۔

ڈاکٹر محمد حسن نے فیض صاحب سے ن۔م۔راشد کے متعلق استفسار کیا کہ وہ متشکک تھے کہ نہیں۔فیض صاحب نے جواب دیا کہ وہ متشکک تھے اور اس منزل سے آگے نہیں بڑھے۔فیض صاحب نے بتایا کہ ہم لاہور میں تھے جب ن۔م۔راشد کا انتقال ہوا تھا اور ان کی وصیت کے مطابق ان کے جسد خاکی کو جلا دیا گیا تھا اور ان کی موت کے غم میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جس کی صدارت فیض صاحب نے کی تھی۔کسی مولانا نے یہ سوال کیا تھا کہ راشد مسلمان تھے یا نہیں؟

فیض صاحب نے جواب دیا ہم نے ایم اے تک عربی پڑھی ہے مگر مولوی یا فقیہ نہیں ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی فتویٰ لگا سکیں البتہ انہوں نے ایک حدیث ضرور پڑھی تھی۔اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن نے

فیض صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اب تک سب سے زیادہ خوبصورت ادیب کسے پایا؟ تو کہنے لگے

''ترکی کے شاعر ناظم حکمت سے زیادہ خوبصورت آدمی نہیں دیکھا۔۔۔ایک بار

ترکی حکومت نے انہیں اشتراکی ہونے کے الزام میں قید کر دیا۔''۱۱۶

جیلر کی صاحبزادی ناظم حکمت پر عاشق ہوگئی تھی اور اسی کی مدد سے ناظم حکمت جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ناظم حکمت کئی مدت تک سویت یونین میں رہے جہاں انہیں حکومت کی طرف سے ہر قسم کی سہولتیں میسر تھیں مگر ترکی سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ وطن کی یاد میں مچھلی کی طرح تڑپتے تھے۔

ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد حسن نے انٹرویو کے درمیان بتایا کہ فیض صاحب پھر بیروت چلے گئے تھے اور ۱۹۸۰ء میں مرادآباد میں ہندو مسلم فسادات میں ڈاکٹر محمد حسن کا آبائی مکان جلا دیا گیا اور ان کے والد کو پولیس نے گرفتار کرلیا۔فیض صاحب کو ماسکو میں محمودہ بیگم سابق پرنسپل گورنمنٹ ویمن کالج سری نگر سے اس حادثے کی خبر ملی۔انہوں نے دکھ کا ظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو خط بھی لکھا۔

ڈاکٹر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ لندن سے مجاہد علی ترمذی سیکرٹری فیض انٹرنیشنل اکاڈمی کا خط بھی آیا کہ وہ وہاں اکاڈمی اور لندن یونیورسٹی کے ملٹی لنگوول شعبے کے زیر اہتمام جشن فیض منا رہے ہیں۔فیض صاحب نے فرمائش کی ہے کی میں اس جشن میں شرکت کرسکوں۔میں نے بھی انہیں لکھ بھیجا کہ میں ضرور شرکت کرتا مگر میرے پاس آنے جانے کی رقم نہیں۔فیض صاحب کے دوست ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ جب فیض صاحب کو ڈاکٹر صاحب کے مالی حالات کا پتہ چلا تو انہوں نے کہا کی ڈاکٹر محمد حسن کو بلانے کا انتظام کرنا پڑے گا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتے حکومت ہند کے ثقافتی امور کے شعبے سے میری ٹکٹ کا انتظام ہوگیا اور میں لندن پہنچ گیا۔جشن فیض شروع ہوا امریکا، جرمنی، فرانس، ہندوستان، پاکستان کے نمائندگوں نے شرکت کی۔اس جشن کے متعلق دو تین باتیں یاد رہیں گی۔پروفیسر فیشر پیرس سے آئے ہوئے تھے۔وہ

فیض صاحب کے پرانے دوست تھے انہوں نے فیض صاحب کی ٹریڈ یونین تحریک میں خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ کس طرح ہندوستانی سرکاری کے وفد اور پاکستانی حکومت اور سرمایہ کاروں کے نمائندوں نے عالمی مزدور تحریک کو ناکام کوشش کی جسے فیض صاحب نے اور مضبوط کر دیا۔ مذاکرے کے آخری اجلاس میں شاعر ساقی فاروقی نے فیض صاحب سے سوال کیا کہ آپ شاعروں کی نئی نسل کو کیا نصیحت کرنا چاہیں گے۔ تو فیض صاحب نے جواب دیا :

''ان کو یہی مشورہ دوں گا کہ میری پیروی سے بچیں اور اپنی منفرد آواز میں شعر کہیں۔''[۱۱۷]

مزید ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ ماسکو کے نرسنگ ہوم سے فیض صاحب کا خط موصول ہوا کہ یہاں ان کا تفصیلی طبی معائنہ ہوا ہے۔ ان کے مطابق ڈاکٹر ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور پھر فیض صاحب کی وفات کی خبر آئی۔ انتقال سے چند ہفتے پہلے وہ اپنے آبائی وطن سیالکوٹ گئے تھے، وہاں اپنے سبھی ساتھیوں سے ملے۔ تقریباً ان کی نواسی کی سالگرہ تھی اور وہیں پر ان کی طبعیت خراب ہوگئی۔ اسی رات اسپتال لے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ یہ ایک عظیم انسان اور ایک عظیم شاعر کی موت کا منظر تھا۔ جس نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو نئی زندگی دی اور ان کے دکھ درد بانٹے۔ ان کے جنازے میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ ارباب اقتدار، نان بائی، مزدور، باغی نوجوان اور وہ لوگ جنہوں نے فیض کے لئے ایسے حالات پیدا کر دئے تھے۔ جنہوں نے ان کو تکلیفیں دیں اور ملک کے ساتھ غداری کی۔ مزید ڈاکٹر حسن لکھتے ہیں کہ فیض صاحب نے پیغمبروں جیسے اوصاف پائے تھے۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے

ڈاکٹر محمد حسن فیض صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں جن اصولوں اور سچائیوں کی خاطر ہم مصیبتیں برداشت

کرنا اور قربانیاں دینا چاہتے ہیں لیکن ہم اپنے اندر اس کا حوصلہ پیدا نہیں کر پائے۔ اس کا عکس ہمیں فیض صاحب کی شخصیت اور فن میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ آخر میں فیض صاحب کے انداز بیاں کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔ یہاں دوسرے آدمی کی موجودگی نے تحریر کو روشن کر دیا ہے۔ اسے دوسرے آدمی نے فیض کی شاعری کو کثیر الجہتی اور کثیر الکیفیاتی شاعری بنا دیا ہے۔ جس میں حافظ کی غنایت اور مغربی رومانیت کی سیالیت پائی جاتی ہے۔

بقول ڈاکٹر محمد حسن:

''وہ ایک شئے سے دوسری صنف کے شئے کی صفات منسوب کر کے مرکب تاثر

پارے تیار کرتے ہیں۔ جو مختلف حواس کی کیفیات بیدار کر سکیں۔''۱۱۸

ڈاکٹر ایوب مرزا:

ڈاکٹر ایوب مرزا اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ فیض صاحب کو کتنا جانتے ہیں اور ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جولائی ۱۹۸۴ء میں فیض اکادمی نے لندن یونیورسٹی کے ہال میں فیض پر انٹرنیشنل سیمینار منعقد کیا تھا اس میں مقالہ پڑھنے کے لئے ہندوستان سے تین نامور ادیب پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن جواہر لعل نہرو یونیورسٹی اور ڈاکٹر گوپی چندر دہلی یونیورسٹی سے بلائے گئے تھے اور پاکستان سے ڈاکٹر ایوب مرزا (راقم) کو دعوت دی گئی تھی اور اس مقالے کا انتخاب فیض صاحب نے خود کیا تھا۔ فیض صاحب ماسکو سے تشریف لائے تھے۔ چونکہ ان کی صحت اچھی نہیں تھی اور فیض صاحب کو اس بات کا دکھ بھی رہا تھا کہ وہ اپنی ادھوری نظموں کو مکمل نہ کر سکے اور ایک طویل نظم بھی نہ لکھ سکے۔ میرے خیال میں فیض کے رومانوی ابتداء ابتداء دور کی نظموں کے بعد ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' ایک ایسی نظم ہے جس نے اردو ادب میں اپنا ایک مقام بنالیا اور دوسری نظم ''یہ داغ داغ اجالا'' نے

فیض صاحب کو ایک نئی پہچان دیا اور پھر جیل میں قید تنہائی کی بدولت فیض کا جو کلام ہمارے سامنے آیا "دست صبا" کی صورت میں برصغیر کی ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی پر چھا گیا تھا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ طویل نظم کیا ہوتی ہے اس کی خصوصیت کے بارے میں بتائیں ۔فیض صاحب کہنے لگے:

> ''بھئی طویل نظم کا اپنا ایک شہرہ ہوتا ہے ۔ملٹن کی مشہور طویل نظم (Divine comedy) نے ہمارے ہاں بھی اثر ڈالا ہے۔ملٹن نے بقول ہم عصر شاعروں کے شاعری میں عامیانہ اشعار استعمال کئے ہیں اور یوں غیر شاعرانہ حرکت کا ارتقاب کیا ہے۔بھئی ہمارے اقبال مرحوم اس سے بہت متاثر تھے اور انہوں نے بھی روایتی الفاظ اور بندشوں سے گریز کیا۔ایسے الفاظ کو جنہیں قراء غیر شاعرانہ اور عامیانہ سمجھ کر اپنی شاعری کا دامن بچاتے رہے۔علامہ اقبال نے پہلی مرتبہ برملا اور فراخدلی سے استعمال کیا۔''۱۱۹

یوں ملٹن کی طرح ان پر بھی اعتراض کیا گیا تھا کہ انہوں نے شاعری میں عامیانہ الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ آج بھی شاعری کی نئی زبان پیدا ہو چکی ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کبھی طویل نظم لکھنے کی خواہش کی۔فیض صاحب نے جواب دیا کہ دل بہت چاہتا ہے کہ طویل نظم لکھوں لیکن کبھی حالات نے مہلت نہیں دی۔ہم نے ایک بار طویل نظم شروع کی تھی مگر اسے مکمل نہیں کر سکے۔وہ نظم انتساب ہے اور فیض صاحب کو پسند بھی بہت ہے۔ایوب مرزا نے فیض صاحب کی نظم صبح آزادی کے بارے میں بات کی:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

کہ اس نظم نے آپ کو بہت اچھالا ہے۔ رجعت پسند دانشور اور خبار نویس ہمیشہ آپ پر الزام تراشی کرتے رہے کہ آپ نے آزادی کو تسلیم نہیں کیا اور صبح آزادی کے نور کو یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر کہا ہے۔ تو بولے:

''بھئی ایسے نادان داناؤں کے پاس کوئی خفیہ سبب تو ضرور ہوگا۔ کبھی کبھی مخلص لوگوں کو بھی کوتاہ اندیشی اور کوتاہ بینی معروضی perspective حالات کا تجزیہ نہیں کرنے دیتی اور vested interest بھی کوئی چیز ہوتی ہے نا۔ وہ کسی نہ کسی حیلے سے ترقی پسند طاقتوں کو اور خیالات پر بودے اور غیر حقیقت پسندانہ حملے کرتے رہتے ہیں۔ ان سے گھبرانا نہیں چاہئے۔''[۱۲۰]

فیض صاحب مزید بتاتے ہیں کہ ہمیں جو آزادی ملی تھی اس میں اتنی جانیں گئیں کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ کئی گھر تباہ ہوئے ظاہر ہے یہ وہ آزادی کی منزل نہیں تھی جس کا خواب دیکھا تھا اور جس کی آرزو میں یاران وطن سفر پر نکلے تھے اور ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ عوام پر ظلم وستم کے علاوہ ان کو دربدری کی سزا بھی دی جائے گی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد ہر طرف جشن کا سا سماں ہوگا لوگ سکھ کا سانس لے سکیں گے۔ عوام جنہوں نے آزادی وطن کے لئے بے شمار قربانیاں دیں اور وہ لوگ ظلم وستم کا نشانہ بنے۔

پھر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ اس نظم میں کچھ بنیادی باتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اتنی بڑی نظم کو آپ صرف فرقہ وارانہ فسادات کے تاثر تک کیسے محدود رکھ سکتے ہیں تو بولے تم عجیب کرتے ہو یہ فسادات اور بے گناہوں کا قتل کوئی معمولی بات ہے بے شک ہم نے یہ نظم انہیں واقعات سے متاثر ہو کر لکھی تھی اور ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ عوام کی

آزادی کی گھڑی دور ہے مفقود نہیں اور اپنے انٹرویو کے آخر میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے کہا حکمران وقت کہتے ہیں کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا بولے:

''بھئی وہ کہتے ہیں نا کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ باطل کہاں مٹا ہے حق کدھر ہے۔ ابھی تو نشاط وصل حرام ہی ہے۔ لوگ مجروح اور زبوں ہیں، بھائی چارہ اور برابری کی بنا پر مساوات وطن عزیز میں ابھی چارہ ہجراں کے بھکاری ہیں۔ غم واندوہ کے سیلاب میں صبح طلوع ہوتے ہی ایک نئی شام ڈھلنا شروع ہوگئی۔ پھر مال غنیمت کے سیلاب نے رہی سہی شرافت اور شائستگی کا جنازہ نکال دیا۔''[۱۲۱]

فیض صاحب کہتے ہیں کہ ابھی نجات کی گھڑی نہیں آئی۔ وہ منزل جس کا ہمیں انتظار ہے ابھی دور ہے۔ ان کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر لوگوں کے جذبات کی قدر نہ کی گئی اور ان کے اصل مسائل کی طرف توجہ نہیں دی گئی تو ان کی قربانیاں ضائع جائیں گی۔

حوالہ جات

۱۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۱۵

۲۔ ایضاً، ص ۱۷

۳۔ ایضاً، ص ۲۱

۴۔ ایضاً، ص ۲۲

۵۔ ایضاً، ص ۲۳

۶۔ صہبا لکھنوی ، ''فیض مستند حالات مشتملہ افکار فیض نمبر'' مکتبہ افکار، ۱۹۶۵ء، کراچی، مشتملہ اشفاق حسین ''فیض احمد شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء

۷۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر۔ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص: ۶۷

۸۔ آئی اے رحمان، ''فیض محروم طبقات کی آواز''، مشمولہ مکالمات فیض، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص: ۱۰۲، مرتبہ: خلیل احمد

۹۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، "فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۲۴

۱۰۔ صلاح الدین حیدر، ڈاکٹر، ''فیض احمد: شخصیت و فن''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۵۱

۱۱۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۸۸..۸۹

۱۲۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳، لاہور، ص ۲۶

۱۳۔ ایضاً،ص ۲۸

۱۴۔ ایضاً،ص ۳۶

۱۵۔ ایضاً،ص ۳۷

۱۶۔ ایضاً،ص ۳۸

۱۷۔ ایضاً،ص ۴۴

۱۸۔ ایضاً،ص ۴۸

۱۹۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۹۰

۲۰۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳، لاہور، ص ۵۳

۲۱ ۔ ایضاً ،ص ۵۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۶۳

۲۳۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، لاہور، ص ۹۴

۲۴۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۶۶

۲۵۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، ''فیض فاشزم اور مہاتما گاندھی''، مشمولہ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد، جلد نمبر ۲۸، شمارہ نمبر ۲، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶

۲۶ ۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، "فیض نامہ"، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۷۶

۲۷ ۔ ایضاً،ص ۷۷

۲۸ ۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، ''فیض فاشزم اور مہاتما گاندھی''، مشمولہ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جلد نمبر ۲۸، شمارہ نمبر ۲، ۲۰۱۱ء، ص ۲۶

۲۹۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، ''فیض احمد فیض شاعر اور شخص''، مکتبہ دانیال، ۱۹۹۹ء، کراچی، ص ۴۵

۳۰۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، لاہور، ص ۹۵

۳۱۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۸۰

۳۲ ۔ ماہرہ خانم، ''فیض کی غزل گوئی''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ، مشمولہ حیدر، صلاح الدین، ڈاکٹر، ''فیض احمد فیض شخصیت و فن''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۶۲

۳۳۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، "فیض نامہ"، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۸۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۸۲

۳۵۔ کے کے کھلر، ''فیض احمد فیض''، مشمولہ اشفاق حسین، ''فیض احمد فیض: شخصیت اور فن''، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء، اسلام آباد، ص ۴۳

۳۶۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، ''فیض احمد فیض شاعر اور شخص''، مکتبہ دانیال، ۱۹۹۹ء، کراچی، ص ۴۷

۳۷۔ یوسف بلوچ، ''فیض احمد فیض اور مزدور''، ماہ نو، فروری ۲۰۰۲ء، لاہور، ص ۹۱

۳۸۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۹۶

۳۹۔ سبط حسن، ''سخن در سخن''، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۹ء، کراچی، ص ۸۴

۴۰۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۹۷

۴۱۔ ایضاً، ص ۹۸

۴۲۔ ایضاً،ص ۹۸

۴۳۔ مظفر اقبال، ''فیض سے مکالمہ''، مشمولہ فیض کے مغربی حوالے، جنگ پبلشرز ،۱۹۹۲ء، لاہور، ص ۲۰۵

۴۴۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۱۰۱

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۵۱۔ ظفر اللہ پوشنی، ''زندگی زندہ دلی کا نام ہے''، مشمولہ صلاح الدین حیدر، ڈاکٹر، ''فیض احمد فیض''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۶۶

۵۲۔ احمد سلیم، "فیض : یادیں، باتیں"، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۹۷

۵۳ ۔ فیض احمد فیض، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۱ء، کراچی، ص ۸

۵۴۔ سبط حسن، ''سخن در سخن''، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۹ء، کراچی، ص ۳۲

۵۵۔ سجاد ظہیر، سید، کچھ ''دست صبا'' کے بارے میں، مشمولہ ماہ نو، شمارہ نمبر ۲، جلد نمبر ۵۵، فروری ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۵-۱۰۶

۵۶۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۱۴۱

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔۱۳۳

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۵۹۔ فیض احمد فیض، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۱ء، کراچی، ص ۴۲

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۸۔۲۷

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۹

۶۲۔ ایضاً، ص ۲۸۔۲۷

۶۳۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۱۷۲

۶۴۔ فیض احمد فیض، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۱ء، کراچی، ص ۱۰۱

۶۵۔ سجاد ظہیر، سید، ''کچھ دست صبا کے بارے میں''، مشمولہ ماہ نو، جلد نمبر ۵۵، شمارہ نمبر ۲، فروری ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۵

۶۶۔ فیض احمد فیض، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۱ء، کراچی، ص: ۱۱۱

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔۱۴۷

۶۸۔ ایضاً، ص ۲۰۱

۶۹۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۱۹۸

۷۰۔ ایضاً، ص ۲۴۹

۷۱۔ الیگزنڈر سرکوف، ''ایک حوصلہ مند دل کی آواز''، مشمولہ نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں، لاہور، ص ۲۳

۷۲۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۲۵۲

۷۳۔ ایضاً، ص ۲۵۸

۷۴۔ ایضاً، ص ۲۷۱۔۲۷۰

۷۵۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۷۶۔ سبط حسن، ''سخن در سخن''، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۹ء، کراچی ، ص ۶۵

۷۷۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۲۷۹

۷۸۔ ایضاً، ص ۲۸۳

۷۹۔ ایضاً، ص ۲۸۳

۸۰۔ ایضاً، ص ۲۹۴

۸۱۔ ایضاً، ص ۳۰۱

۸۲۔ ایضاً، ص ۳۰۱

۸۳۔ ایضاً، ص ۳۰۱

۸۴۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۳۴

۸۵۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، ''فیض احمد فیض''، مکتبہ دانیال، ۱۹۹۹ء، کراچی، ص ۱۳۴-۱۳۵

۸۶۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۳۱۳

۸۷۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۸۸۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۷۲

۸۹۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۳۸۷

۹۰۔ ایضاً، ص ۱۳۸۱-۳۸۲

۹۱۔ ایضاً، ص ۴۵۵

۹۲۔ ایضاً، ص ۴۵۶

۹۳۔ ایضاً، ص ۴۶۱

۹۴۔ یاسر عرفات، ''فیض میرے دوست اور جنگ بیروت کے رفیق تھے''، ماہ نو، فروری ۲۰۰۲، لاہور، ص ۱۹۷

۹۵۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۴۶۴

۹۶۔ ایضاً، ص ۵۵۱

۹۷۔ ایضاً، ص ۵۵۲

۹۸۔ ایضاً، ص ۵۵۲

۹۹۔ ایضاً، ص ۴۲۹

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۵۵۶

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۴۱۷

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۴۱۹

۱۰۳۔ ایضاً، ص ۴۰۸

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۴۰۸

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۴۷۷

۱۰۶۔ ایضاً، ص ۴۷۸

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۴۸۲-۴۸۳

۱۰۸۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۵۴

۱۰۹۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۴۸۴

۱۱۰۔ ایضاً، ص: ۴۸۸

۱۱۱۔ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۵۹

۱۱۲۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۵۱۲

۱۱۳۔ ایضاً، ص ۵۲۵

۱۱۴۔ ایضاً، ص ۵۲۶

۱۱۵۔ ایضا، ص ۵۲۷

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۵۳۱

۱۱۷۔ ایضاً، ص ۵۳۲

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۵۳۹

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۵۴۱-۵۴۲

۱۲۰۔ ایضاً، ص ۵۴۴

۱۲۱۔ ایضاً، ص ۵۴۷

باب چہارم:

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' اور ''فیض نامہ'' کا تقابلی مطالعہ

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' اور ''فیض نامہ'' کا تقابلی مطالعہ:

ڈاکٹر ایوب مرزا فیض شناسی کی روایت میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ جس کا ثبوت اپنی دو کتابوں "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" اور "فیض نامہ" میں دے چکے ہیں۔ کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ مگر ایوب مرزا بعض جگہوں پر تحقیقی سقم کا بھی شکار ہوئے ہیں۔ مثلاً وہ فیض صاحب کا انٹرویو کرتے وقت تاریخ کا صحیح اندراج نہیں کرتے بلکہ خود انہوں نے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ فیض صاحب سے گفتگو مختلف اوقات میں ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے واقعات میں ربط نہیں ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی کتاب میں ترقی پسند مصنفین کے بارے میں بات کی۔ خاص طور پر جب انہوں نے منٹو پر فحاشی کے مقدمات کا ذکر کیا۔ وہاں پر ان سے کئی تحقیقی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں جس کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔ ان اغلاط کی نشاندہی احمد ندیم قاسمی صاحب نے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کی تقریب رونمائی میں کی جو ۱۹۷۷ء میں نیشنل سنٹر لاہور میں ہوئی جس میں فیض صاحب بھی موجود تھے۔ بقول ایوب مرزا:

> ''کل چار مقدمات تھے، کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، کھول دو اور دھواں پر۔''[۱]

جبکہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی دوسری کتاب "فیض نامہ" میں کچھ اور بات کی ہے۔

> ''کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، بو اور دھواں پر مقدمات چلے۔''[۲]

احمد ندیم قاسمی نے بھی منٹو کے ان افسانوں کا ذکر کیا ہے جن پر مقدمہ چلا اور وہ ایوب مرزا کے متعلق کہتے ہیں کہ انہوں نے افسانہ ''بو'' کو شامل نہیں کیا اور افسانہ ''کھول دو'' کو شامل کر دیا ہے جبکہ اس پر کوئی مقدمہ نہیں چلا تھا۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

''رسالے میں یہ افسانہ شائع ہوا تھا۔اس پر ۶ ماہ کی پابندی عائد کر دی گئی تھی اور مجھے یاد ہے کہ کھول دو بھی میں نے ''نقوش'' چھاپا تھا اور ''بو'' بھی میں نے ادب لطیف درج کیا تھا۔''[۳]

میری نظر میں احمد ندیم قاسمی کی رائے زیادہ مستند ہے کیونکہ انہوں نے اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر ایوب مرزا کو ہدایت کی تھی کہ موجودہ کتاب میں جو غلطیاں انہوں نے کی ہیں اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر لیں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے ایک بات کو بیان کرنے کے لیے اپنی دونوں کتابوں میں سن کا غلط اندراج کیا ہے۔جیسا کہ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کے بارے میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر تاثیر اور مولانا چراغ حسن حسرت ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے تھے جبکہ احمد ندیم قاسمی انجمن کے سیکرٹری تھے۔بقول ایوب مرزا:

''۱۹۴۸ء میں تاثیر صاحب یکا یک مخالف ہو گئے۔انہوں نے مخالف نظم لکھی اور احسان میں چھپوائی۔مولانا چراغ حسن حسرت کہاں بخشتے۔انہوں نے جواباً نظم لکھ کر نوائے وقت میں چھپوائی۔''[۴]

جبکہ فیض نامہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

''۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر ترقی پسند مصنفین کے مخالف ہو گئے۔''[۵]

اس کی تردید میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ مولانا چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر تاثیر کے درمیان جو قلمی جنگ شروع ہوئی تھی،اس کا سنہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے غلط لکھا ہے۔جبکہ اس جنگ کا آغاز انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل پاکستان کانفرنس کے بعد ہوا۔جو غالباً نومبر ۱۹۴۹ء میں واقع ہوئی تھی۔اس میں مولانا حسرت نے استقبالیہ بھی پڑھا تھا۔ڈاکٹر تاثیر پہلے تو ترقی پسند مصنفین کے رہنما تھے۔ان دنوں وہ ترقی پسند مصنفین کی مخالفت پر اتر آئے تھے اور انہوں نے

ایک روزنامے میں مولانا حسرت کے خلاف نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔مولانا حسرت نے بھی روزنامہ ''امروز'' میں ''فتو لہار'' کے نام سے ان کی نظموں کے منظوم جواب لکھے۔ کچھ دنوں کے بعد میں اور فیض صاحب بھی اس لڑائی میں شامل ہو گئے۔مولانا نے میرے لیے ''سرکوب لاہوری'' کا نام استعمال کیا جبکہ فیض صاحب بھی اس میں کسی فرضی نام سے شامل ہوئے تھے۔بقول احمد ندیم قاسمی:

> ''یہ یادگار مناظمہ ۱۹۴۸ء کی بجائے ۱۹۴۹ء کیا واخر اور ۱۹۵۰ء کے اوائل کا ادبی معرکہ ہے جسے انہی دنوں ہفت روزہ چٹان نے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا تھا۔جن روزناموں میں یہ مناظمہ ہوا،ان کے نام بھی ڈاکٹر ڈاحب نے صحیح نہیں لکھے۔''[۶]

میری رائے میں احمد ندیم قاسمی کی بات زیادہ مستند معلوم ہوتی ہے۔جس کتاب کا میں نے حوالہ دیا ہے وہ بہت بعد کا ایڈیشن ہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے انٹرویو کے درمیان پوچھا کہ آپ کے خیال میں ترقی پسند تحریک کامیاب رہی یا ناکام ہوئی۔تو فیض صاحب بولے قیام پاکستان کے بعد ترقی پسند تحریک میں چند انتہا پسندوں کی شرکت کی وجہ سے اس کو نقصان پہنچا تھا۔ڈاکٹر ایوب مرزا یوں لکھتے ہیں کہ:

> ''احمد ندیم قاسمی اس انجمن کے سیکریٹری تھے۔حکم ہوا کہ علامہ اقبال کو DEMOLISH کریں اور عصمت چغتائی،منٹو اور ن۔م راشد کو EXTERMINATE کریں۔یہ ترقی پسندوں کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ہمیں یہ بک بک لگی۔علامہ اقبال مرحوم کے ہاں بے پناہ ذخیرہ سامراج، جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف ملتا ہے۔''[۷]

اور منٹو کے بارے میں یہی رویہ اپنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے یہی بات اپنی دوسری کتاب میں بھی کی ہے۔

''حکم ہوا کہ علامہ اقبال کا بت توڑ دیں۔ عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور ن۔م راشد کو علیحدہ کر دیں۔ کہ یہ لوگ ترقی پسندی کے معیار پر پورا نہیں اترتے تھے۔ بھئی ہمیں یہ بک بک لگی۔ علامہ اقبال کے ہاں سامراج، نوابوں اور جاگیرداروں کے خلاف بے پناہ ذخیرہ ملتا ہے۔''[۸]

میرے خیال سے ڈاکٹر ایوب مرزا نے سرسری سا جائزہ لیا ہے۔ یہاں پر پوری بات نہیں کی۔ فیض صاحب اس تحریک سے مایوس ہو گئے تھے۔ کیونکہ قیام پاکستان کے بعد ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں انتہا پسندی آ گئی تھی۔ منٹو اور عصمت چغتائی کے بارے میں لوگوں نے غلط رویہ اپنا لیا تھا۔ حالانکہ بنیادی طور نہ منٹو فحش نگار تھے، نہ عصمت۔ فیض صاحب نے ترقی پسند تحریک پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

''البتہ ان کے لکھنے کے طریقے سے اور جس طرح کے موضوع انہوں نے اختیار کیے، اس سے اس طرح کے مغالطے کی گنجائش پیدا ہوتی تھی۔ جس سے ہمیں بھی اختلاف تھا۔ لیکن نہ تو ان کی دیانت داری پر، نہ ان کی حقیقت نگاری پہ کچھ حرف آتا تھا۔ لیکن اس میں وہ ''ایم فیسز''، کا فرق آ جاتا تھا۔''[۹]

میری نظر میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے گفتگو کا کچھ حصہ اس کتاب میں شامل کیا ہے جبکہ فیض صاحب کے ترقی پسند تحریک پر اظہار خیال سے پوری بات واضح ہو جاتی ہے اور یہ حوالہ زیادہ مستند ہے۔ دوسری بات جس کو ڈاکٹر ایوب مرزا نے واضح نہیں کیا وہ علامہ اقبال کے متعلق ہے۔

جبکہ اس کے برعکس احمد ندیم قاسمی جو کہ اس وقت ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے جنرل سیکرٹری تھے۔ وہ کہتے ہیں

کہ ڈاکٹر ایوب مرزا کی اس کتاب کے مطالعے سے پہلے میں یہ سمجھتا رہا ہوں کہ ہم ادیبوں کو جو بھی ہدایات ملتی تھیں۔ وہ فیض صاحب کی طرف سے آتی تھی۔ کم سے کم فیض صاحب کی مرضی ضرور شامل ہوتی تھی اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ انجمن کی طرف سے چند نامور ادیبوں نے بھی بائیکاٹ کر لیا تھا اور احمد ندیم قاسمی اس کے خلاف تھے۔ لیکن اکثریت کے سامنے شکست ماننی پڑی۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

''بعد میں میں نے ہی استصواب رائے عامہ کے ذریعے یہ قرارداد واپس لے لی تھی۔ اس کتاب سے انکشاف ہوا کہ فیض صاحب بھی اسے ''بک بک'' ہی سمجھتے تھے۔ جملہ یہ درج ہے۔ "ہمیں یہ بک بک لگی اور ہماری ان سے جنگ ہوگئی۔''[۱۰]

احمد ندیم قاسمی مزید کہتے ہیں کہ میں انجمن کا جنرل سیکرٹری ہوتے ہوئے بھی لاعلم ہوں کہ یہ جنگ کہاں ہوتی رہی۔ اور یہ کہ نومبر ۱۹۴۹ء کی اس کانفرنس میں جس میں بائیکاٹ کی متفقہ قرارداد منظور کر لی گئی تھی۔ فیض صاحب انجمن کے تمام جلسوں کی پریذیڈیم میں شامل تھے۔ وہ کوئی عہدہ لینے کو تیار نہ تھے مگر ہم نے فیصلہ کیا کہ وہ کہیں بھاگ نہ جائیں۔ انہیں انجمن کا خزانچی منتخب کر لیا۔ یہ اور بات ہے کہ خزانہ ہی نہیں تھا ورنہ ان کی خدمات لی جاتیں۔ یہاں پہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے محض سرسری سا جائزہ لیا ہے۔ اس کے مقابلے میں احمد ندیم قاسمی کا حوالہ زیادہ مستند ہے۔ ایک جگہ پر ڈاکٹر ایوب مرزا نے لکھا ہے کہ فیض صاحب نے بتایا ایک دن مظہر علی خاں کے گیراج میں انجمن کی میٹنگ ہوئی۔ صفدر میر اس کے صدر تھے۔ بقول فیض صاحب:

''قاسمی صاحب نے علامہ اقبال کے خلاف ایک بھرپور مقالہ پڑھا۔ ہمیں بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ ہم نے اعتراض کیا کہ یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو سکہ بند قسم کی بے معنی انتہا پسندی ہے۔ ہماری نہ مانی گئی۔ ہم بہت دل

برداشتہ ہوئے۔اس کے بعد ہم انجمن کی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے۔''[11]

یہی بات ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' میں بھی بیان کی ہے۔جبکہ اس کے برعکس ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کے متعلق جو باتیں لکھی ہیں۔ان میں ایک بات تو واضح ہے کہ انہوں نے انجمن کے ایک ہفت روزہ اجلاس میں علامہ اقبال پر ایک مضمون پڑھا تھا۔جس میں شاہ امان اللہ خاں،شاہ نادر شاہ،اور نواب بھوپال کے حوالے سے علامہ کے مرد مومن کے جو عملی معیار ہیں ان پر اظہار تجسس کیا تھا اور شاہین کے کبوتر پر حملے پر کبوتر کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔اصل بات تو قاسمی کا مضمون ہے جو انہوں نے علامہ اقبال کے خلاف پڑھا تھا۔بقول احمد ندیم قاسمی:

> ''فیض صاحب نے میرے اس مضمون پر نہایت عالمانہ اور بے حد مثبت بحث کی۔اور فرمایا کہ علامہ کی سامراج دشمنی اور ملایت دشمنی کے سامنے ان کی کوئی خامی ٹھہر نہیں سکتی۔انجمن کی تاریخ فیض صاحب کے یہ ارشادات ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔وہ انجمن کے عام جلسوں میں پہلے بھی شاذ ہی شریک ہوتے تھے۔اس واقعے کے بعد تو شرکت بالکل ترک کردی۔''[12]

اور یہ نومبر ۱۹۲۹ء کی کانفرنس سے بہت پہلے کا بیان ہے۔میری نظر میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے تمام واقعات کا کلی طور پر احاطہ نہیں کیا جس سے اس کے خدوخال واضح ہونے میں بہت سی مشکلات درپیش آتی ہیں۔احمد ندیم قاسمی کی معلومات زیادہ مستند ہیں۔انہوں نے ڈاکٹر ایوب مرزا سے شکایت بھی کی تھی کہ آپ کے اس کتاب میں بہت سی غلطیاں ہیں جن کی اگلے ایڈیشن میں تصحیح کرنی ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے لکھا ہے۔

> ''یہ کانفرنس نہایت کامیاب ہوئی اور اس موقعہ کے لیے ہم نے ''تماشہ ہم بھی دیکھیں گے''لکھی۔ان دنوں احمد ندیم قاسمی انجمن کے سیکریٹری تھے۔''[13]

اوراس کا سال ایوب مرزا کے مطابق ۱۹۸۴ء کا ہے۔جبکہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی دوسری کتاب میں بیان کیا ہے۔

''ترقی پسند مصنفین نے اپنی کانفرنس لاہور کے اوپن ائرتھیٹر میں منعقد کی۔جوش و ولولہ دیدنی تھا۔لوگوں کے حوصلے بلند تھے۔ان دنوں انجمن کے سیکریٹری احمد ندیم قاسمی تھے۔یہ کانفرنس بے حد کامیاب رہی۔اس کانفرنس کے اجلاس میں فیض نے قوالی ''تماشہ ہم بھی دیکھیں گے'' پڑھی۔''[۱۴]

اس کا سن بھی ۱۹۴۸ء ہے۔جبکہ احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۲۹ء کی کانفرنس سے بہت پہلے کا اس کا سن بتایا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ:

''فیض صاحب نے اس کے ہر اجلاس میں شرکت کی تھی اور اس کا آخری اجلاس اوپن ائرتھیٹر کی پہاڑی کے نیچے منعقد ہوا تھا۔جہاں سیکڑوں لوگ ترقی پسند مصنفین کے خلاف نعرہ بازی کر رہے تھے اور فیض صاحب نے قوالی ''وہ آئیں سر مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے'' پڑھی۔''[۱۵]

میری رائے کے مطابق احمد ندیم قاسمی کا حوالہ زیادہ مستند ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنے انٹرویو میں فیض صاحب سے ترقی پسند تحریک کا پوچھا کہ وہ کامیاب ہوئی یا ناکام۔بقول فیض:

''بولے ایک طرح سے تو یہ کامیاب رہی۔۔۔۔دوسرے لحاظ سے اس تحریک کو دھکا لگا، وہ ہمارے چند انتہا پسند دوستوں کی وجہ سے۔''[۱۶]

اور یہی بات فیض صاحب نے ''فیض نامہ'' میں بھی کی ہے جس کا صفحہ نمبر ۹۳ اور ۹۴ ہے۔جبکہ احمد ندیم قاسمی

صاحب نے ڈاکٹر ایوب مرزا کی اس بیان کی تردید کی ہے۔ترقی پسند مصنفین کی تحریک ختم نہیں ہوئی تھی۔

بقول احمد ندیم قاسمی:

''تنظیمیں ختم ہونے سے ایسی تحریکیں ختم نہیں ہوا کرتیں جو تنظیم کی توانائی کی بجائے

اپنی توانائی کے بل بوتے پر چلتی ہیں۔''۱۷

اور آج ہمارے ہاں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ اسی تحریک کی وجہ سے ہے۔اس تحریک نے ہمارے ادب کا مالا مال کر دیا ہے۔اور ایک محقق کی ذمہ داری ہے جہاں ڈاکٹر ایوب مرزا نے غیر مستند معلومات فراہم کی ہیں وہیں پر ان کی اصلاح کی جائے تا کہ قاری کو پڑھنے کے لیے نئی چیز میسر آ سکے۔ایک مقام پر ڈاکٹر ایوب مرزا نے آدم جی ادبی انعام کی توہین کی ہے وہ فیض صاحب سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''کسی انقلابی پاکستانی شاعر یا ادیب کو آدم جی پرائز مل جائے اور وہ فخریہ اپنی

تخلیق کو آدم جی انعام کہلوا کر خوش ہو۔''۱۸

اس پر احمد ندیم قاسمی صاحب نے اعتراض کیا ہے۔بقول فیض:

''کم سے کم انہیں تو ایک معمولی سے ملکی انعام کے سلسلے میں یوں احساس کمتری کا

اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔''۱۹

مزید یہ کہ جیسے ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کو ایم بی ای کا خطاب ملنے کا جواز پیش کیا تھا تو وہ آدم جی ادبی انعام کے لیے بھی کوئی جواز پیش کر دیتے۔جس طرح انہوں نے کہا کہ ایلفر ڈ نوبیل ایک بہت بڑا سرمایہ دار تھا اور اس کے نوبل انعام کی دنیا بھر میں بہت عزت کی جاتی ہے چونکہ وہ بہت بڑی اقم پر مشتمل ہے جبکہ آدم جی بھی ایک بڑا سرمایہ دار ہے اگر چہ اس کے انعام کی رقم معمولی سی ہے لیکن اس پسماندہ ملک کے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے ملک کا انعام ہے بلکہ اس کی

توہین نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ فیض صاحب منیلا سے واپس لوٹے تو ہم انہیں ایئر پورٹ پر لینے گئے کیا دیکھتے ہیں۔

''فیض صاحب نہایت صورت دیدہ زیب، دھاری دار سوٹ میں ملبوس تھے۔''[۲۰]

جبکہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے اس بات کی مکمل طور پر تردید کی ہے کہ فیض صاحب جامہ زیب آدمی ہیں اس لیے لباس دیدہ زیب ہو یا ڈھیلا ڈھالا ان پر ہمیشہ فٹ رہتا تھا لیکن انہوں نے منیلا کے سفر کے دوران ایسا کوئی لباس نہیں پہنا تھا۔ البتہ واقعہ یوں ہے۔

''پاکستان کے روزناموں کے سولہ مدیروں کا وفد چین جا رہا تھا۔ میں بھی اس شامل تھا فیض صاحب اس وفد کے قائد تھے۔ ہم لوگوں کو دو تین روز ہانگ کانگ میں رکنا پڑا۔''[۲۱]

جبکہ ''فیض نامہ'' میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے یہ بیان کیا ہے:

''۱۹۵۵ء میں فیض احمد کی قیادت میں صحافیوں کا ایک وفد جس میں احمد ندیم قاسمی اور مولانا اختر علی خان بھی شامل تھے عوامی جمہوریہ چین کے سرکاری دورے روانہ ہوئے۔''[۲۲]

قاسمی صاحب کی بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فیض صاحب جامہ زیب آدمی ہیں اور انہوں نے ہانگ کانگ میں ایسا لباس تیار کروایا تھا لیکن ایوب مرزا واقعات کو آگے پیچھے بیان کرتے ہیں۔

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' اور ''فیض نامہ'' کا تقابلی مطالعہ:

ذیل میں ان دونوں کتابوں کا تقابل کرتے ہوئے مختلف عنوانات قائم کر دیے گئے تا کہ قاری کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ سب سے پہلے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے پہلا عنوان پیش کیا ہے وہ اپی لاگ کے نام سے ہے جوان کی بیٹی نے لکھا ہے۔ وہ فیض صاحب کی خدمت میں تعارفی تقریر کرتی ہے کہ میرے ڈیدی تو ہوشیار آدمی ہیں ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور شکست بھی ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ خود کو سوشلسٹ سمجھتے ہیں ساتھ ہی وہ شاعر بھی ہیں۔ ایک لحاظ سے تو فیض صاحب کی بیٹی نے اپنے والد صاحب کی مرقع نگاری کی ہے جس کو پڑھ کر فیض یابی ملتی ہے۔ بس وہ ا: یک ہی بات کرتے ہیں

مہلت نہ دی فیض کبھی بخیہ گری نے

میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ زندگی میں انہوں نے ایک ہی غلط بات کی ہے کہ زندگی نے کبھی مہلت نہ دی حالانکہ ان کے پاس مہلت کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ فیض صاحب ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔

جبکہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض نامہ کا پہلا عنوان ''فیض'' ایوب مرزا کی وفات پر لکھا۔ فیض صاحب کو غلط اطلاع ملی کہ ڈاکٹر ایوب مرزا وفات پا گئے ہیں۔ ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کہاں سے لکھنا شروع کروں پھر میں نے اپنی وفات سے آغاز کر دیا۔

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے عنوانات کے تحت نہیں لکھا انہیں جہاں جو بات یاد آ گئی لکھ ڈالی۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ فیض صاحب بہت بڑے شاعر ہیں اگر چہ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں لیکن دنیا انہیں مان چکی ہے۔ اس کے علاوہ وہ نہایت کمال کے کارساز بھی ہیں۔ فیض صاحب کے اردگرد ایسے بھی لوگ موجود تھے جو کرنل، جنرل کے عہدے تک پہنچ چکے تھے لیکن ان کی کچھ مسائل تھے جن کی وجہ سے ان کی شادی نہیں ہو رہی تھی ہم نے ان

کی گتھی سلجھا دی اب یہ اپنی زندگیوں میں خوش ہیں۔ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ میں فیض صاحب کے ساتھ تین چار گھروں سے گھوم آیا تھا سب ماشاءاللہ خوش وخرم تھے اور فیض صاحب اس کے بدلے میں صرف ایک چائے کی پیالی پیتے تھے۔ یہ فیض صاحب کی ایک خوبی تھی جس سے بہت سے لوگ نا آشنا ہیں اور ڈاکٹر ایوب مرزا نے ہمیں اس سے متعارف کرایا ۔''فیض نامہ'' میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کی ''توقیت'' لکھی ہے اور اس کے ساتھ ہی فیض صاحب کے اسلاف پر ایک باب بھی پیش کر دیا ہے اگر ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کی بات کی جائے تو اس میں بھی ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کے والدین کے متعلق ابتدائی معلومات لکھی ہوئی ہیں۔''فیض نامہ'' میں کتاب کے تقریباً پہلے ۳۰ صفحات فیض صاحب کے والدین کے بارے انکشافات سے بھرے ہوئے ہیں۔ہم کہ ٹھہرے اجنبی بے شک ایک سوانحی عمری ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' کے نام سے الگ کتاب نہیں لکھی بلکہ پہلی کتاب کی توسیع کر دی ہے۔جس کو پڑھنے کے بعد قاری کو نئی معلومات نہیں ملتی بلکہ وہی باتیں دہرائی جا رہی ہیں اور اگر دیکھا جائے تو تحقیقی نقطہ نظر کے تحت یہ دونوں کتابیں نہیں لکھی گئیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا کے پاس فیض صاحب کی زندگی کے متعلق معلومات کا کافی ذخیرہ تھا تو انہوں اسے لوگوں تک پہنچا دیا۔ پھر ڈاکٹر ایوب مرزا کی تحریروں میں ترتیب کا فقدان ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں فیض صاحب کے ایک ایڈونچر کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح چکی چلاتے ہوئے ان کی انگلی پر زخم کا نشان کیسے لگا تھا کیونکہ وہ تو خان بہادر کے بچے تھے ان کی پرورش انتہائی ناز ونعم میں ہوئی تھی۔ہم کہ ٹھہرے اجنبی میں صفحہ نمبر ۲۷ پر اس کو بیان کیا ہے جبکہ اسی واقعہ کو ''فیض نامہ'' میں بھی بیان کیا ہے۔اس کا صفحہ نمبر ۴۴۳ ہے اور ''فیض نامہ'' میں فیض صاحب کے پیدائش، بچپن اور تعلیم پر بھی لکھا ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' فیض صاحب کی برطانوی فوج کے متعلق لکھا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ فیض صاحب نے وہاں پر کیا ذمہ داریاں سرانجام دیں۔

بقول ایوب مرزا:

''میرے ذمے ایک تو مختلف محاذوں پر ہندوستانی سپاہیوں کے لیے پبلک ریلیشنز یا

اطلاعات بہم پہنچانے کا کام تھا۔''۲۳

اور یہی باتیں ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' میں بھی بیان کی ہیں۔اگر فرق ہے تو صرف الفاظ کا اور اس کا صفحہ نمبر ۶۰۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی دونوں کتابوں میں فیض صاحب کی خدمات کے پیش نظر ایم بی ای کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی آدم جی ادبی انعام کا مذاق بھی اڑایا ہے ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔پھر فاشزم کا پورا پس منظر بیان کیا ہے اور اس نقطے کو ''فیض نامہ'' تفصیل سے بیان کیا ہے۔''فاشزم کا ایشیاء میں زور'' اس کا صفحہ نمبر ۷۲ ہے یہاں پر فرق صرف یہ ہے کہ'' ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' سرسری سا واقعہ بیان کیا ہے۔جبکہ فیض نامہ میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔بلکہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی دونوں کتابوں میں فیض صاحب کی فوج میں ملازمت اختیار کرنے کی وجوہات بیان نہیں کیں۔ان کے یہاں معلومات کا فقدان ہے اور وہ واقعے کہ تہہ تک نہیں جاتے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے ایک واقعہ کو دو جگہوں پر بیان کیا ہے جسکی ضرورت نہیں تھی اور تحقیقی نقطہ نظر سے اس کی کوئی افادیت نہیں ہے صرف وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔اپنے ایک انٹرویو میں فیض صاحب سے پوچھا کہ آپ نے جنگ کے دوران بہت کم لکھا تو فیض صاحب نے جواب دیا کہ ہم عملی طور پر جنگ میں شریک ہوئے ہیں لیکن پھر بھی لکھا ہے۔بقول فیض:

''تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آئی ہے، پھر نور دسحر دست و گریباں ہے سحر سے، اور

میرے ہمدم میرے دوست،'' اسی دور کا کلام ہے اور ہاں بھئی'' سیاسی لیڈر کے نام

نظم ہے وہ ہم نے گاندھی کے لیے لکھی تھی۔''۲۴

یہی بات ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی دوسری کتاب ''فیض نامہ'' میں بھی بیان کی ہے۔اس کا صفحہ نمبر ۷۹ ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی دونوں کتابوں میں فیض صاحب کی فوج کی ملازمت چھوڑنے کی اطلاع دی ہے اور یہ بھی

بتایا ہے کہ ایک دن وہ چھٹی لے کر لاہور آئے اور پروفیسر چیٹر جی جو کہ ڈائریکٹر ایجوکیشن تھے ان سے ملے اور کہا کہ اب ہم واپس آنا چاہتے ہیں ہماری استادی واپس کر دو اس سے پہلے کہ فیض صاحب کوئی کالج جوائن کرتے پھر میاں افتخار الدین ان کے پاس آئے اور کہا کہ ہم ''پاکستان ٹائمز'' لاہور سے نکال رہے ہیں اور میں اس کی چیف ایڈیٹری کے لیے تمہارا نام دے آیا ہوں یہی ساری باتیں ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' میں بھی بیان کی ہوئی ہیں اس وقت یہاں ان باتوں کو ڈسکس کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دونوں کتابوں میں ایک ہی مواد ڈال دیا ہے جس سے قاری کے لیے بوریت کا باعث بنتی ہیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا'' نے ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن اقیام اور اس میں فیض صاحب کی شمولیت کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی انجمن ترقی مصنفین پاکستان کا آغاز کیسے ہوا اور اس میں دراڑ کیسے پیدا ہوئی یہ سب کچھ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں بیان کیا ہے اور بالکل یہی موضوع ''فیض نامہ'' میں بھی بیان کیا ہے اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان اس موضوع کو ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' صفحہ نمبر ۹۰ پر بیان کیا ہے اگر فرق ہے تو صرف موضوع کی ترتیب صحیح درج نہیں ہے باقی باتیں ایک جیسی ہیں۔ آگے چل کر ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب اور مشتاق احمد گورمانی کی ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے اور اس عنوان کو اٹھا کے ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' میں بھی شامل کر دیا ہے۔ مشتاق احمد گورمانی سابق گورنر سندھ تھے اوہ وہ فیض صاحب سے اپنی تقاریر لکھوایا کرتے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے خود لکھا ہے کہ اس کتاب میں واقعاتی اور زمانی اعتبار سے شاید تسلسل نظر نہ آئے کیونکہ فیض صاحب سے گفتگو مختلف اوقات میں ہوئی ہے اور ایسا ہی ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کی دونوں کتابوں میں تضاد بھی ملتا ہے ''فیض نامہ'' میں ایوب مرزا نے عنوانات کو سن کے مطابق کچھ حد تک ایک ترتیب سے لکھا ہے مگر ان کی پہلی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' موضوعات کی ترتیب اور سن کا بالکل بھی لحاظ نہیں رکھا گیا جس کی وجہ سے محقق کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ایسی کتابیں ادب میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کتاب کے درمیان میں راولپنڈی سازش کیس کے متعلق بیان کیا اور

اس کے ساتھ ہی فیض صاحب کی نظر بندی کے دوران ان کے گھریلو حالات کا بھی ذکر کر دیا فیض صاحب کی نظر بندی کے دوران سلیمہ اور منیزہ کی پڑھائی بھی کافی خراب ہو چکی تھی۔اس سلسلے میں جو بھی مشکلات آئیں ایلس نے ان کا جوانمردی سے مقابلہ کیا اور وہ پہلی بار فیض صاحب سے کس طرح جیل میں ملیں۔اس کا صفحہ نمبر ۱۵۷ سے ۱۶۷ تک ہے۔جبکہ ڈاکٹر ایو ب مرزا نے ''فیض نامہ'' راولپنڈی سازش کیس پر مشتمل ایک مفصل نوٹ لکھا ہے اور اس کا صفحہ نمبر ۱۱۲-۱۲۷ ہے اور اگلا عنوان فیض صاحب کی نظر بندی کے دوران ان کے گھریلو حالات پر تحریر کیا ہے اور اس کا صفحہ نمبر ۱۲۸- ۱۳۲ ہے۔پھر ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کی بیٹیوں سے جو گفتگو کی ہے اس کو اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ''فیض نامہ'' کے آخر میں فیض صاحب کی بیٹیوں کے نام سے اپنا ایک انٹرویو شامل کر دیا ہے دونوں کتابوں میں باتیں اتنی بار دہرائی گئی ہیں کہ ان کو پڑھنے کا دل نہیں کرتا۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے واقعات کو بیان کرتے ہوئے سنہ کا بالکل غلط اندراج کیا ہے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' ماسکو سے لندن،لندن سے کراچی اور کراچی سے سیدھے جیل جا پہنچے اگر دیکھا جائے تو راولپنڈی سازش کیس کے بعد فیض صاحب کے جیل سے لکھے گئے خطوط ہیں جو اردو ادب میں اہمیت رکھتے ہیں اور اس کے بعد فیض صاحب کی جیل سے رہائی کا ذکر نہیں ہے۔جبکہ میں سمجھتی ہوں کہ ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب ''فیض نامہ'' ایک مکمل سوانحی عمری ہے اور فیض شناسی میں بھی کافی مددگار ثابت ہوتی ہے اس کے برعکس ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں ڈاکٹر ایوب مرزا ک نے فیض صاحب کے متعلق جو کچھ بھی لکھ ہے اس میں ربط نہیں ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر ایوب مرزا نے جو اگلا عنوان تحریر کیا ہے اس کا ایک ربط بنتا ہے کیونکہ فیض صاحب جب جیل سے رہا ہوئے تو ان کے لیے اصل مسئلہ روزگار کا تھا۔ملک میں مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا۔اس کا صفحہ ۱۸۵ اور ۱۸۶ ہے اور اس میں چین کے انقلاب کی باتیں لکھی ہوئی ہیں جن کی یہاں ضرورت نہیں تھی جبکہ ''فیض نامہ'' سے رہائی کے نام سے عنوان پیش کیا ہوا ہے۔اس سا صفحہ نمبر ۲۵۸ سے ۲۵۹ ہے اور اسی عنوان میں چین کے انقلاب کو ڈسکس کیا ہوا ہے۔اگر ڈاکٹر ایوب مرزا ادیب یا سوانح نگار نہ ہونے کے باوجود

لکھتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ کافی حد تک کامیاب رہتے کیونکہ ایوب مرزا نے فیض صاحب کی جیتی جاگتی شخصیت کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے اور اس سے مستقبل کی نسلیں بھی مستفید ہوں گی اور یہ کہ ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب کے کتنے قریب تھے اور ان سے ہر موضوع پر بات بھی کی اگر ان واقعات کو ترتیب سے لکھتے تو بہت حد تک کامیاب بھی رہتے۔اب اس کے بعد انہوں نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں فیض صاحب کے لندن میں قیام کا ذکر کیا ہے اور وہاں سے واپسی کا ذکر کیا ہے اور اسی عنوان میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے پوچھا کہ آپ ماسکو میں کیوں نہ رہے واپس پاکستان آنے کی کیا ضرورت تھی۔''فیض نامہ'' میں بھی ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کے لندن میں قیام کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ۱۹۶۴ء میں صدر ایوب خاں کے بلدیاتی الیکشن کے متعلق بیان کیا ہے وہ ایک عنوان کے اندر بہت سی باتیں بیان کر جاتے ہیں جس کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔آگے چل کر ایوب مرزا کو بات یاد آ گئی کہ فیض صاحب کا نکاح اور شادی کیسے ہوئی تھی اس کے متعلق لکھ ڈالا جبکہ وہ فیض صاحب کے متعلق ان کی بیٹیوں کے انٹرویو کر چکے ہیں۔فیض صاحب کا انٹرویو چھاپ دیا۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے زیادہ تر ذاتی نوعیت کی باتیں بھی کی ہیں میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دور کی سہی فیض صاحب کے خاندان سے رشتہ داری بھی تھی کہ فیض صاحب کی افغان نژاد والدہ سائر جان سے شیریں گل زوجہ ڈاکٹر ایوب مرزا سے رشتہ داری تھی۔آگے چل کر ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، فیض اور پاک بھارت جنگ کے موضوع کو تفصیل سے بیان کیا ہے اس کا صفحہ نمبر ۲۲۶ سے ۲۴۱ ہے میں یہ بھی کہنا چاہوں گی موضوع تو دہرائے جا رہے ہیں لیکن اس میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے بے تکی باتیں شامل کی ہوئی ہیں۔یہ موضوع ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' بیان کر دیا ہے اور اس کا صفحہ نمبر ۲۸۰ سے ۲۸۶ ہے۔پھر ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، نیشنل آرٹس کونسل کی سرگرمیاں بیان کی ہیں اس کا صفحہ نمبر ۲۵۳ سے ۲۶۰ ہے جبکہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے یہی عنوان ''فیض نامہ'' میں بھی بیان کر دیا ہے جس کا صفحہ نمبر ۳۱۶ سے ۳۲۴ ہے۔آگے چل کر ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کی پنجابی شاعری

کے بارے میں لکھا ہے اور ''فیض نامہ'' میں بھی پنجابی شاعری کے متعلق لکھا ہے۔ پھر فیض صاحب نے اپنی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں فیض اور سقوط مشرقی پاکستان کے بارے میں تحریر کیا ہے اور اس کا صفحہ نمبر ۲۶۹ سے ۲۷۶ ہے جبکہ یہی عنوان ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' میں بھی پیش کیا ہے اس کے ساتھ ہی ایوب مرزا نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں فیض صاحب کا دورہ بنگلہ دیش کے متعلق تفصیلاً بیان کیا ہے جس کا صفحہ نمبر ۲۷۷ سے ۲۸۹ ہے پھر اسی موضوع کا اٹھا کے ڈاکٹر صاحب نے ''فیض نامہ'' میں بھی چھاپ دیا ہے۔ یہاں پر ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کے دورہ روس کی بات کی ہے یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے جب وہ خود ساختی جلاوطنی اختیار کر کے راولپنڈی سے سے نکل کر برطانیہ سے ہوتے ہوئے ماسکو جا پہنچے اور حسب معمول طبی معائنہ کروایا۔ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' ڈاکٹر ایوب مرزا نے صرف روس کے دورے کی بات کی ہے اور اس کا صفحہ نمبر ۲۹۰ سے ۳۰۰ ہے۔ ''فیض نامہ'' میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض بیروت میں کے عنوان سے لکھا ہے ۔اس میں انہوں نے یہ بیان نہیں کیا کہ انہوں نے کتنا عرصہ وہاں قیام کیا تھا اور اس کا صفحہ نمبر ۴۶۰ سے ۴۶۹ ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں ویت نام کی جنگ آزادی کے متعلق فیض صاحب کا انٹرویو شامل کیا ہے جس کا صفحہ نمبر ۳۰۱ سے ۳۱۱ ہے۔

آگے چل کر ڈاکٹر ایوب مرزا نے پھر آرٹس کونسل کی سرگرمیاں بیان کی ہوئی ہیں اس کا صفحہ نمبر ۳۲۸ سے ۳۳۷ ہے۔

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے عنوانات کے تحت نہیں تحریر نہیں کیا بلکہ اس کو مختلف نشستوں میں مکمل کیا۔ وہ فیض صاحب کا انٹرویو کرتے وقت تاریخ کا صحیح اندراج نہیں کرتے اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر ایوب مرزا نے یہ کتاب تحقیقی نقطہ نظر سے نہیں لکھی بلکہ ان کے پاس فیض صاحب سے متعلق جو کچھ مواد تھا اسے لوگوں تک پہنچا دیا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کی تحریروں میں ترتیب کا فقدان ہے۔ ''فیض نامہ'' میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے عنوانات قائم کیے ہیں یہ ایک

مکمل سوانحی عمری لگتی ہے جس میں فیض صاحب کے متعلق تمام معلومات مکمل ترتیب کے ساتھ مل جاتی ہیں۔

تحقیقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر ایوب نے مرزا کی دونوں کتابوں میں تکرار اور تضاد بیانی کثرت سے ملتی ہے۔ان دونوں کتابوں میں مواد میں ترتیب کا فقدان ہے۔''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں واقعات میں زمانی اعتبار سے ربط نہیں ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا کی دوسری کتاب ''فیض نامہ'' کو ایک مکمل سوانحی عمری کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کتاب میں فیض صاحب کے متعلق ایک تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔یہ ایک حوالے کی کتاب کے طور پر شمار ہوتی ہے۔یہ کوئی روایتی طرز کی سوانحی عمری نہیں بلکہ بکھرے ہوئے خیالات ہیں جنہیں ڈاکٹر ایوب مرزا نے یادوں کی ایک مضبوط لڑی میں پرونے کی کامیاب سعی کی ہے ۔ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب ''فیض نامہ'' فیض شناسی میں اہم مقام رکھتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۳۱

۲۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۹۸

۳۔ قاسمی، احمد ندیم، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، کلاسیک، ۲۰۰۴ء، لاہور، ص ۶

۴۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۱۳۵

۵۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۹۶

۶۔ قاسمی، احمد ندیم، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، کلاسیک، ۲۰۰۴ء، لاہور، ص ۷

۷۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۱۳۷

۸۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۹۷

۹۔ فیض احمد فیض، ''فیض کا ترقی پسند تحریک پر اظہار خیال''، مکالمات فیض، مرتبہ: خلیل احمد، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، لاہور، ص ۲۸۸

۱۰۔ قاسمی، احمد ندیم، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، کلاسیک، ۲۰۰۴ء، لاہور، ص ۷

۱۱۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء
اسلام آباد، ص ۱۳۸

۱۲۔ قاسمی، احمد ندیم، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، کلاسیک، ۲۰۰۴ء، لاہور، ص ۸

۱۳۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۱۳۵

۱۴۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۹۵

۱۵۔ قاسمی، احمد ندیم، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، کلاسیک، ۲۰۰۴ء، لاہور، ص ۸

۱۶۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۱۳۷

۱۷۔ قاسمی، احمد ندیم، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، کلاسیک، ۲۰۰۴ء، لاہور، ص ۸

۱۸۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۶۰

۱۹۔ قاسمی، احمد ندیم، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، کلاسیک، ۲۰۰۴ء، لاہور، ص ۸

۲۰۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۹

۲۱۔ قاسمی، احمد ندیم، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، کلاسیک، ۲۰۰۴ء، لاہور، ص ۱۰

۲۲۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، کلاسیک، ۲۰۰۳ء، لاہور، ص ۲۵۱

۲۳۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۵۷

۲۴۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، اسلام آباد، ص ۸۰

حاصل مطالعہ

حاصل مطالعہ

میں نے ڈاکٹر ایوب مرزا کی فیض شناسی کے حوالے سے کام کیا ہے اس سے قبل ڈاکٹر ایوب مرزا کی فیض شناسی پر کوئی کام نہیں ہوا تھا اور اس کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں ڈاکٹر ایوب مرزا کے احوال و آثار بیان کیے ہیں کہ ڈاکٹر ایوب مرزا ۲۱ مئی ۱۹۲۹ء کو میر پور کشمیر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم میر پور، لاہور، جالندھر اور راولپنڈی سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے حاصل کی۔ ایوب مرزا پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور ان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے قیام پاکستان کی ابتدا ہی سے ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ۱۹۵۰ء میں طلباء کی بائیں بازو کی تنظیم ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام میں حصہ لیا اس تنظیم کے تحت مستقل متحرک رہے اور ۱۹۵۴ء میں جب حکومت پاکستان نے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کو غیر قانونی قرار دے دیا تو وہ کچھ عرصہ ملک چھوڑ کر برطانیہ چلے گئے لیکن ۱۹۶۴ء میں فیض صاحب کے کہنے پر پاکستان واپس لوٹ آئے اور کچھ عرصے تک نیشنل عوامی پارٹی میں سیاسی جدوجہد کو جاری رکھا اور بھٹو صاحب کی وزارت خارجہ کے دور میں ایوب مرزا نے پاک چین دوستی کی بنیاد رکھی۔ کافی عرصہ تک دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے اپنی خدمات بہم پہنچاتے رہے اور فیض صاحب کے ساتھ ان کے اچھے خاصے تعلقات تھے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا فیض شناسی میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ اگر ان کی ادبی خدمات کی بات کی جائے تو انہوں نے فیض صاحب پر دو کتابیں تحریر کیں۔ پہلی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' جو ایک سوانح عمری ہے اور حوالے کی کتاب کے طور پر شمار ہوتی ہے اور دوسری کتاب ''فیض نامہ'' ہے جو انڈیا سے شائع ہوئی ہے اور ایک اہم کام دادا امیر حیدر پر سوانحی ناول ہے جو پہلی بار ''دام موج'' سے شائع ہوئی لیکن ایوب مرزا نے اسے نئے سرے سے تحریر کیا یہ ناول ''داستان امیر حیدر'' کے نام سے کلاسیک لاہور سے شائع ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ ایک دستاویزی ناول ہے۔

دادا امیر حیدر نے اپنی یادداشتیں ٹوٹی پھوٹی تحریر میں لکھی ہوئی تھیں۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے اسے نئے سرے سے تحریر کیا تھا۔

۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر ایوب مرزا کی ٹانگ میں خون کا کلاٹ بننے کے بعد علاج کے لیے اپنی بیٹی علینہ کے پاس گلاسکو منتقل ہو گئے۔۱۹۹۶ء میں پاکستان لوٹے ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔۲۰۰۰ء میں ''برگ جہاں دیدہ'' کے نام سے اپنی خودنوشت تحریر کی۔پھر ڈاکٹر ایوب مرزا نے پروفیسر سجاد حیدر کے ساتھ مل کر ۱۹۸۱ء میں رومانیہ کے قومی شاعر کے مجموعے کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔اس کتاب کو ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی نے شائع کیا۔اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ میہائی ایمی نیسکو اور مرزا غالب کی شاعری میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے شاید اس کی وجہ دونوں کی سوچ اور طرز فکر و احساس ایک جیسا ہے اور دوسری وجہ جس معاشرے میں یہ دونوں شاعر زندگی گزار رہے تھے، وہاں ایک فرسودہ نظام رائج تھا۔وہ اس نظام کو تبدیل کرنا چاہتے تھے۔دونوں میں فرق یہ ہے کہ اپنے معاشرے پر انقلاب فرانس کی بدولت ایمی نیسکو غالب کی بدولت تشکیک کی منزل پر رکنے کی بجائے انقلاب کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ڈاکٹر ایوب مرزا نے میہائی ایمی نیسکو کی شاعری کو اردو زبان و ادب میں شامل کر کے ایک اہم اضافہ کر دیا ہے۔

دوسرے باب ''کہہ ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں میں نے سب سے پہلے عنوانات قائم کیے پھر فیض صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی۔جس سے کچھ لوگ نا آشنا ہیں۔یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ فیض صاحب علم و فن میں یکتائے ماہر ہیں۔اس کے ساتھ ہی وہ نہایت کمال کے کارخانہ ساز بھی ہیں وہ لوگوں کی بگڑی بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔یہ ان کی انفرادیت ہے۔اس کے بعد میں نے یہ بتایا کہ فیض صاحب اور علامہ اقبال کی ملاقات کیسے ہوئی تھی اور علامہ صاحب سے ان کے تعلقات کیسے تھے۔ایک وجہ تو یہ تھی کہ فیض صاحب کے والد علامہ اقبال کے ہم عصر تھے اور لندن میں بھی ان کی ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔فیض صاحب نے گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے علامہ اقبال سے سفارشی خط بھی لکھوایا تھا۔فیض صاحب کی علامہ اقبال سے نیاز مندی تھی۔اس کے بعد میں نے فیض صاحب کے والدین

کے متعلق بیان کیا اور یہ بھی کہ ترقی پسند تحریک کا آغاز اور اس میں فیض صاحب کی شمولیت کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ ہی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کب اور کہاں منعقد ہوئی اس کے متعلق بیان کیا تا کہ قاری کو فیض صاحب کے متعلق معلومات آسانی سے مل سکے۔اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ امرتسر کے قیام کے دوران فیض صاحب نے لاہور سے نکلنے والے ادبی پرچے ''ادب لطیف کی ادارت'' کے بھی فرائض سرانجام دیے۔

اس زمانے میں فیض صاحب نے جدید اور ترقی پسند ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت مختلف ادبی گروہ بندیاں تھیں ایک طرف ادب برائے ادب والا گروہ تھا اور دوسری طرف ادب برائے زندگی والا گروہ تھا ان کی آپس میں چپقلش رہتی تھی چونکہ ترقی پسند ادیب یا ترقی پسند خیالات رکھنے والوں کو اپنی تخلیقات چھاپنے کے لیے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت تھی اس سلسلے میں فیض صاحب نے ادب لطیف کی صورت میں ایک پلیٹ فارم تشکیل دیا۔

راقمہ نے فیض صاحب کی ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں دلچسپی اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ پوسٹل یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے۔آگے چل کر میں نے فیض صاحب کی بیٹیوں کے انٹرویو بھی شامل کیے ہیں۔ کیونکہ جب فیض صاحب راولپنڈی سازش کیس میں ملوث ہو کر جیل چلے گئے تھے۔پہلے فیض صاحب کو حیدرآباد جیل میں رکھا گیا پھر کراچی جیل منتقل ہوئے کیونکہ فیض کے دانتوں اور کانوں میں تکلیف رہتی تھی جس کی وجہ سرکار سے اجازت لے کر جناح ہسپتال میں داخل کیے گئے پھر اس کے بعد منٹگمری (ساہیوال) جیل بھیجے گئے یہاں پر فیض صاحب کے دانتوں میں تکلیف شروع ہوگئی تھی پھر فیض صاحب کو لاہور جیل لایا گیا تا کہ اپنے دانتوں کا علاج کروا سکیں۔انہی دنوں فیض صاحب کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔فیض صاحب کو پولیس کی گاڑی میں جانا ہوتا تھا ایک دن کیا ہوا کہ فیض صاحب کو گاڑی نہ مل سکی اور انہیں تانگے میں مسلح گارڈ کے ساتھ ہسپتال جانا پڑا۔لارنس روڈ، مال روڈ، کچہری روڈ اور راوی روڈ سے گزرے

تو لوگوں نے فیض صاحب کو پہچان لیا اور قافلہ کی صورت ان کے ساتھ چلنے لگے اسی واقعہ کے بعد فیض صاحب نے خوبصورت نظم لکھی تھی۔ ''آج بازار میں پابجولاں چلو''۔فیض صاحب کے جیل جانے کے بعد سلیمہ اور منیزہ کی پڑھائی کافی متاثر ہو چکی تھی ایلس نے اپنے گھر اور بچیوں کو کس طرح سنبھالا ان سب کے متعلق بیان کیا ہے۔ایک بار جب فیض صاحب ماسکو تشریف لے گئے تھے وہاں سے لندن چلے گئے ملک میں حالات میں حالات کافی خراب ہو گئے تھے پھر فیض صاحب لندن سے کراچی آئے اور ان کو جیل منتقل کر دیا گیا اس بار فیض صاحب شاہی قلعہ میں قید تھے یہاں پر دوسرے سیاسی قیدی بھی تھے۔ایک عجیب اتفاق ہے کہ فیض صاحب کے والد صاحب بھی کسی زمانے میں شاہی قلعے میں قید رہے تھے۔

ایلس کے پاس کوئی جمع پونجی نہیں تھی کہ اپنے گھر کے اخراجات پورے کرتیں تو فیض صاحب جیل سے نظم یا غزل لکھ کر بھیجتے جسے بیچ کر ایلس اپنے گھر کا خرچہ پورا کرتیں تھیں۔ان سب باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ فیض صاحب نے اپنے ملک کی خاطر کتنی قربانیاں دیں اور ہمارے دل میں فیض صاحب کی محبت اور بڑھ جاتی ہے۔

تیسرے باب ''فیض نامہ'' میں راقمہ نے عنوانات قائم کی۔سب سے پہلے میں نے فیض صاحب کی پیدائش، بچپن اور تعلیم کے متعلق بیان کیا اور یہ بھی بیان کیا کہ فیض صاحب کو بچپن سے ہی کتابوں سے کتنی دلچسپی تھی اور انہوں نے شاعری کس سے متاثر ہو کر لکھی۔پھر ۱۹۳۵ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے استاد کی ملازمت مل گئی اور اس دوران فیض صاحب کی ملاقات ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی اور یہ ملاقات فیض صاحب کے لیے اہم ثابت ہوئی کیونکہ اس وقت وہ کسی کے عشق میں مبتلا تھے ڈاکٹر رشید جہاں مارکسی دانشور تھیں انہوں نے فیض صاحب کو رومانیت کے گرداب سے باہر نکالا اور دنیا کے غموں کی طرف متوجہ کیا یہ سب باتیں میں نے بیان کی ہیں۔یوں ڈاکٹر رشید جہاں فیض صاحب کی نظریاتی مرشد تھیں۔جن کی وجہ سے فیض صاحب مارکسزم کی راہ پر چلنے لگے۔پھر میں نے ترقی پسند مصنفین اور فیض صاحب کی اس میں شمولیت اور اس ان کے کردار کا جائزہ لیا ہے کہ ترقی پسند مصنفین پاکستان میں کس حد تک کامیاب رہی۔

اس کے بعد میں نے فیض صاحب کی برطانوی فوج میں نوکری اور ملازمت کے دوران ان کی خدمات کا جائزہ لیا ہے اور ان محرکات کا بھی جائزہ لیا ہے جن کی وجہ سے فیض صاحب نے فوج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ملازمت کے دوران فیض صاحب کو ایم بی ای کا خطاب بھی ملا تھا۔ اس کے بعد فیض صاحب نے پاکستان ٹائمز میں چیف ایڈیٹر کی خدمات سرانجام دیں۔ میں نے فیض نامہ میں فیض صاحب کی زندگی کے متفرق پہلوؤں کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں مثلاً راولپنڈی سازش کیس، فیض صاحب کی گرفتاری اور فیض صاحب کی نظر بندی کے دوران فیض صاحب کے گھر کے حالات کا بغور جائزہ لیا ہے۔ راولپنڈی سازش کیس کے متعلق فیض صاحب نے بتایا کہ قصہ اتنا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک دن بیٹھ کر بات کی کہ اس ملک کے حالات کیسے بہتر بنائے جائیں۔ ملک کو بنے ہوئے چار سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس ملک میں آئین نام کی کوئی چیز نہیں تھی اوع اس کو راولپنڈی سازش کا نام دیا گیا۔ فیض صاحب کو بہت لمبی سزا سنائی گئی تھی۔

فیض صاحب کے جیل سے ایلس کے نام لکھے گئے خطوط کا بھی ذکر کیا ہے جو اردو ادب میں ایک اہم دستاویز کی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں فیض صاحب کی زنداں میں لکھی گئی شاعری کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ان خطوط کی مدد سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں مثلاً اس زمانے کے حالات کے بارے میں فیض صاحب کا نقطہ نظر حالانکہ پابندیوں کی وجہ سے وہ کھل کر اظہار نہیں کر سکتے تھے اور ان کے ذہنی ارتقا کے بارے میں کہ وہ ان کے ادبی منصوبے کیا ہیں اور وہ اپنے دوستوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

ان سب عنوانات کو ایک ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے تا کہ قاری کو پڑھنے میں آسانی رہے۔ راقمہ نے اس باب میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ فیض صاحب کو ان کی خدمات کے پیش نظر ۱۹۶۲ء میں لینن امن انعام سے نوازا گیا۔ لینن امن انعام لینے کے بعد فیض صاحب کچھ عرصہ لندن میں قیام پذیر ہوئے تھے مگر ان کا دل نہیں لگتا تھا اور واپس آ گئے تھے۔ فیض صاحب نے لندن سے واپس آنے کے بعد ۱۹۶۴ء میں عبداللہ ہارون کالج میں پرنسپل کی نظامت کے فرائض بھی سر

انجام دیے۔اس کے ساتھ ہی پاکستان کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ۔فیض صاحب ویسے تو امن پسند انسان تھے لیکن قومی زندگی میں ایسے موڑ بھی آجاتے ہیں جہاں انسان کو اپنے نظریے کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہاں پر بھی ایسا ہوا جب سرکار کو فیض صاحب کے مشوروں کی ضرورت پڑی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور جنگ کے اختتام پر فیض صاحب نے گیت نما نظم ''سپاہی کا مرثیہ'' بھی لکھا۔ پھر میں نے ماسکو ادیبوں کی کانفرنس کا جائزہ بھی لیا کہ مئی ۱۹۶۷ء میں سوویت یونین ماسکو میں ادیبوں کی چوتھی کانفرنس یا کانگریس کا انعقاد ہوا جس میں فیض صاحب نے بھی شرکت کی تھی۔اس زمانے میں ادیبوں کو خاص عزت دی جاتی تھی جبکہ فیض صاحب اور کرشن چندر کو ایسے بٹھایا گیا کہ وہ ایک دوسرے کا جانتے بھی نہ ہوں۔آخر میں فیض صاحب نے کرشن چندر سے کہا کہ میری اور آپ کی ملاقات صرف ماسکو میں ہوتی ہے پھر تو سوویت یونین کو چاہیے کہ وہ ادیبوں کی ملاقات کا بندوبست کرلیا کریں۔اس کے بعد میں نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ ملک کے حالات خراب ہوجاتے ہیں اور ایک بار پھر ملک میں مارشل لاء لگ جاتا ہے۔فیض صاحب نے اس موقع پر بہت کچھ لکھا ۔ پھر میں نے سقوط مشرقی پاکستان کے حوالے سے بھی جائزہ لیا ہے کیونکہ مشرقی پاکستان میں ہونے والے المناک واقعات کے پس منظر میں فیض صاحب کا احتجاجی کلام بھی شامل ہے۔جس میں انہوں نے اپنے مظلوم عوام سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کا عہد کیا ہے جہاں ظلم ہو اس کے خلاف آواز اٹھاؤ۔

اس کے بعد میں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ فیض صاحب نے محکمہ کلچر و ثقافت کو سنبھالا انہوں نے دل چسپی کے ساتھ پاکستانی خدوخال کا نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا فیض صاحب چار سال تک اس ادارے کے چیئرمین رہے۔ اس دوران فیض صاحب ماسکو تشریف لے گئے اور ان کے پیچھے مخالفت نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور فیض صاحب کو چیئرمین کے عہدے سے ہٹا کر مشیر تعلیم بنا دیا گیا۔آخر کار فیض صاحب نے اس ادارے کو خیر باد کہہ دیا ان سب باتوں کا میں نے جائزہ لیا ہے۔ پھر فیض صاحب نے ۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد پاکستانی وفد کے ہمراہ بنگلہ دیش کا دورہ بھی کیا

اوراس دورے سے واپسی پر فیض صاحب نے ایک غزل بھی لکھی۔اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیکسلا یونیورسٹی کے منصوبے کا بھی جائزہ لیا ہے۔ابھی اس منصوبے پر کام ہورہا تھا کہ فیض صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

فیض صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں اور ہر میدان میں اپنا لوہا منوایا ہے۔یہاں پر میں فیض صاحب کی فلم سازی کے متعلق بات کروں گی۔انہوں نے دو پاکستانی فلموں کے گانے اور مکالمے بھی لکھے۔فلم ''جاگو ہوا سویرا'' اس کے ڈائریکٹر اے جے کاردار تھے اور دوسری فلم ''دور ہے سکھ کا گاؤں'' جو ریلیز نہ ہوسکی۔فیض صاحب کی پہلی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' کو فلم سازی میں ایک تخلیقی کوشش کہا جاسکتا ہے۔

میں نے فیض صاحب کی ادب وسیاست سے وابستگی کے حوالے سے جائزہ بھی لیا ہے اور ادب کے بارے میں ان کی آراء بھی جانی ہیں۔میں نے اس بات کا بھی جائزہ لیا ہے کہ فیض صاحب روس نواز ہیں۔فیض صاحب کہتے ہیں کہ میں نے کبھی ایک ملک کی حمایت نہیں کی۔فیض صاحب نے اپنا موقف دیا کہ میں نے چین پر تین نظمیں لکھی ہیں جبکہ روس پر ایک نظم لکھی ہے مجھے یہ چین روس کا جھگڑا پسند نہیں۔اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی جائزہ لیا ہے کہ بھارت کے متعدد شہروں میں جشن فیض انتہائی جوش وخروش سے منایا گیا۔فیض صاحب نے بھی اس کا جواز یہ پیش کیا کہ میری بھی خواہش تھی کہ اس خوبصورت اور تاریخی شہر کو جی بھر کے دیکھوں اور آپ لوگوں سے بات چیت بھی کروں۔آج میری یہ خواہش پوری ہو گئی ہے۔میں نے افغانستان کی جنگ کے حوالے سے بھی جائزہ لیا ہے۔اس موقع پر فیض صاحب نے شاعری کے ذریعے اپنی آواز بلند کی۔میں نے اپنے ملک کے حالات کے حوالے سے جائزہ لیا ہے کہ ۱۹۷۷ء جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ گرا کر ملک میں مارشل لاء نافذ کرلیا۔فیض صاحب نے اپنے ملک سے نکل کر خودساختہ جلاوطنی اختیار کرلی تھی۔فیض صاحب بیروت چلے گئے اور وہاں جا کر انہوں نے ''لوٹس'' کی ادارت سنبھال لی۔فلسطینیوں کے ہمراہ ان کی جنگ میں بھی شریک رہے۔فیض صاحب نے کوئی تین سال کے قریب جلاوطنی میں گزارا اور میں نے اس بات کا بھی

جائزہ لیا ہے کہ ان کا مجموعہ کلام ''مرے دل مرے مسافر'' جلاوطنی کے زمانے کا ہے۔ مرے دل مرے مسافر کا انتساب یاسر عرفات کے نام لکھا ہے۔ میں نے فیض صاحب کے ادب اور شاعری کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر بیان کیا ہے یہ بھی بتایا ہے کہ فیض صاحب شاعری میں روایت پسندی کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ آخر میں فیض صاحب کے بارے میں چند احباب کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے فیض صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور فیض صاحب کے لیے اپنے جذبات کا بھی تبادلہ خیال کیا ہے۔

چوتھے باب تقابل (''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' اور ''فیض نامہ'') میں تقابل کرتے ہوئے میں نے مختلف عنوانات قائم کر دیے ہیں تا کہ قاری کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ سب سے پہلے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں پہلا عنوان پیش کیا ہے وہ اپی لاگ کے نام سے ہے جو ان کی بیٹی نے تحریر کیا ہے۔ فیض صاحب کی خدمت میں ایک تعارفی تقریر ہے کہ میرے ڈیڈی ہوشیار آدمی ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ ایک لحاظ سے ان کی بیٹی نے اپنے والد کی مرقع نگاری کی ہے۔ بس وہ ایک ہی بات کرتے ہیں کہ مہلت نہ دی فیض کبھی بخیہ گری نے۔

حالانکہ دیکھا جائے تو ان کے پاس مہلت کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض نامہ کا پہلا عنوان ''فیض ''ایوب مرزا کی وفات پر لکھا۔ کیونکہ فیض صاحب کو غلط اطلاع ملی تھی کہ ڈاکٹر ایوب مرزا وفات پا گئے ہیں۔ ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کہاں سے لکھنا شروع کروں۔ میں نے اپنی وفات سے آغاز کر دیا۔ تقابل کرتے وقت میں نے اس بات کا بھی جائزہ لیا ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں عنوانات کے تحت نہیں لکھا جہاں جو بات یاد آ گئی وہاں لکھ دی۔ آگے چل کر ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ فیض صاحب علم و فن کی دنیا میں ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں اگر چہ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' میں'' توقیت فیض''، لکھی ہے اور اس کے ساتھ ہی فیض صاحب کے اسلاف پر ایک عنوان بھی پیش کر دیا ہے اور اگر ''ہم کہ

ٹھہرے اجنبی'' کی بات کی جائے تو ڈاکٹر ایوب مرزا نے اس کتاب میں بھی فیض صاحب کے والدین کے متعلق ابتدائی معلومات لکھی ہوئی ہیں جن کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی بے شک ایک سوانح عمری ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' کے نام سے کوئی الگ کتاب نہیں لکھی بلکہ ہم کہ ٹھہرے اجنبی کی توسیع کر دی ہے۔ جس کو پڑھنے کے بعد قاری کو کوئی نئی معلومات نہیں ملتیں بلکہ وہی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر ایوب مرزا نے یہ دونوں کتابیں تحقیقی نقطہ نظر سے نہیں لکھیں بلکہ ان کے پاس فیض صاحب کے متعلق جتنا بھی مواد تھا اسے لوگوں تک پہنچا دیا۔ میں نے اس بات کا بھی جائزہ لیا ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا کی تحریروں میں ترتیب کا فقدان ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا فیض صاحب کا چین روس کے معاملے پر انٹرویو کر رہے تھے۔ انہیں درمیان میں بات یاد آ گئی فیض صاحب کی انگلی پر زخم کا نشان کیسے آیا اور اس کو بیان کرنے لگے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی تحریروں میں ربط کا بالکل بھی خیال نہیں رکھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں فیض صاحب کی برطانوی فوج کی ملازمت کے حوالے سے لکھا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ فیض صاحب کے ذمے مختلف محاذوں پر ہندوستانی سپاہیوں کے لیے اطلاعات بہم پہنچانے کا کام تھا۔ اسی واقعہ کو ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' میں بھی بیان کیا ہے اور اگر فرق ہوگا تو صرف الفاظ کا باقی باتیں تو ایک جیسی ہیں ۔ اسی طرح پورے کے پورے عنوانات ایک جیسے ہیں ان میں کوئی ردو بدل نہیں ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں واقعاتی اور زمانی اعتبار سے ربط نظر نہ آئے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فیض صاحب سے گفتگو مختلف اوقات میں ہوئی ہے اس لیے سن کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' میں کسی حد تک ایک ترتیب سے لکھا ہے اور اس کو حوالے کی کتاب کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو موضوعات کے لحاظ سے یکسانیت پائی جاتی ہے اور دوسرا ان دونوں کتابوں میں ایک واقعے کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا فیض شناسی کی روایت میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت اپنی دو کتابوں ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''

اور ''فیض نامہ'' میں دے چکے ہیں۔ان دونوں کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ مگر فیض صاحب بعض جگہوں پر تحقیقی سقم کا بھی شکار ہوئے ہیں۔ڈاکٹر ایوب مرزا سے ان دونوں کتابوں میں تحقیقی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان اغلاط کی نشاندہی احمد ندیم قاسمی صاحب نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' ۲۰۰۴ء کے ایڈیشن کی تقریب رونمائی میں کی۔میں نے اس بات کا بھی جائزہ لیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے گذارش کی ہے کہ انہوں نے اپنے موجودہ ایڈیشن میں جو غلطیاں انجام دی ہیں اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر لیں۔

تحقیقی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ایوب مرزا کے ہاں تکرار تضاد بیانی کثرت سے دکھائی دیتی ہے اس کا پرتو ہمیں ان کی دونوں کتابوں ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' اور ''فیض نامہ'' میں بھی نظر آتا ہے۔دونوں کتابوں میں مواد میں ترتیب کا فقدان ہے اور مواد کے حوالے سے دونوں کتابوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ڈاکٹر ایوب مرزا کے ہاں دونوں کتابوں کی پیشکش کا انداز درست نہیں ہے۔ان سب باتوں سے قطع نظر فیض شناسی کے حوالے سے ان کتابوں کی اردو ادب میں بہت زیادہ اہمیت اور افادیت ہے اور فیض شناسی میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ڈاکٹر ایوب مرزا کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے فیض صاحب کی زندگی پر ایک مکمل کتاب تحریر کر دی کیونکہ ان کو فیض صاحب سے عشق تھا۔وہ کافی عرصے تک فیض صاحب سے ملاقاتیں کرتے رہے اور ان سے ان کی زندگی کے بارے میں حالات جانتے رہے جسے بعد میں انہوں نے کتابی صورت میں شائع کروا دیا اور یہ کتاب اس حوالے سے بھی مستند ہے کہ اس میں شامل حالات و واقعات فیض صاحب کے ہی بیان کردہ ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' ہماری پیاس نہیں بجھاتی بلکہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی جی چاہتا ہے کہ یونہی محفل جمی رہے اور ہم فیض صاحب کی باتیں غور سے سنتے رہیں۔اس تشنگی کو ڈاکٹر ایوب مرزا نے ''فیض نامہ'' کے ذریعے دور کر دیا ہے۔یہ کتاب فیض صاحب کے مداحوں اور چاہنے والوں کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے۔

کتابیات

کتابیات

☆ آغا ناصر، "ہم جیتے جی مصروف رہے"، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

☆ آفتاب احمد، ڈاکٹر، "فیض احمد فیض شاعر اور شخص"، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۹۹ء

☆ ابوسعید، قریشی، "فیضان فیض"، کراچی، مکتبہ اسلوب ناظم آباد، ۱۹۸۴ء

☆ احمد سلیم، ''فیض احمد فیض کی نا تمام نورنوشت''، مشمولہ موج زر، لاہور

☆ احمد سلیم، ''فیض: یادیں، باتیں''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

☆ اشفاق حسین، ''فیض ایک جائزہ''، کراچی، ادارہ یادگار غالب، ۱۹۷۷ء

☆ اشفاق حسین، ''فیض احمد فیض: شخصیت اور فن''، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء

☆ اشفاق حسین، ''فیض حبیب عنبر دست''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء

☆ اشفاق حسین، ''فیض کے مغربی حوالے''، لاہور، جنگ پبلشرز، ۱۹۹۲ء

☆ ایلس فیض، ''یادوں کے سائے''، مشمولہ ماہنامہ سپتنک، لاہور، مارچ ۱۹۹۳ء

☆ ایوب مرزا، ڈاکٹر، "ہم کہ ٹھہرے اجنبی"، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

☆ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی''، لاہور، کلاسیک، ۲۰۰۴ء

☆ ایوب مرزا، ڈاکٹر، "فیض نامہ"، لاہور، کلاسیک، ۲۰۰۳ء

☆ ایوب مرزا، ڈاکٹر، حیدر سجاد ملک، ''نظمیں''، راولپنڈی، ندیم پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء

☆ باقر مہدی، ''فیض ایک تجزیہ فن و شخصیت''، بمبئی، مشمولہ، ادب لطیف فیض نمبر، جون ۱۹۸۱ء

☆ برجیس بانو، سیدہ، ''فیض احمد فیض کی اردو صحافت''، کراچی، پاکستان اسٹڈی سنٹر، ۲۰۰۰ء

☆ بشیر سیفی، ڈاکٹر، ''تنقیدی مطالعے''، لاہور، نذیر سنز اردو بازار، ۱۹۹۶ء

☆ ثاقب رزمی، ''فیض محبت اور انقلاب کا شاعر''، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۶ء

☆ ثریا پروین، ''فیض کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ''، بہاولپور، غیر مطبوعہ مقالہ ایم فل، ۲۰۰۸

☆ حسن ظہیر، ''راولپنڈی سازش کیس''، کراچی، آکسفورڈ پریس، ۲۰۰۲ء

☆ خلیق انجم، ''فیض احمد فیض ایک تنقیدی جائزہ''، دلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۵ء

☆ خلیل احمد، ''مکالمات فیض''، مرتبہ: لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

☆ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، ''چند اہم جدید شاعر''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

☆ راشد حمید، ڈاکٹر، ''فیض بہ نام افتخار عارف''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

☆ رشید امجد، ڈاکٹر، ''جدید ادبی تناظر''، راولپنڈی، الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

☆ رفیق چوہدری، ''میری دنیا''، کراچی، پنجاب رنگ پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

☆ ساقی فاروقی، ''بازگزشت و بازیافت''، کراچی، مطبوعہ مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۷ء

☆ ساقی فاروقی، ''ہدایت نامہ شاعری''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

☆ سبط حسن، ''سخن در سخن''، کراچی، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۹ء

☆ سجاد ظہیر، ''روشنائی''، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۶ء

☆ سرفراز اقبال، بیگم، ''دامن یوسف'' (فیض بنام سرفراز)، لاہور، ماورا پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

☆ شاداب ردلوی، ڈاکٹر، ''فیض کے مغربی حوالے'' (مضمون فیض کی شعری جہات، یقین قدر کا مسئلہ)، ۱۹۹۲ء

☆ شاہد ماہلی، ''فیض احمد عکس اور جہتیں''، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء

☆ شیما مجید، ''فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت''، کراچی یونی ورسٹی، پاکستان اسٹڈیز سنٹر، ۲۰۰۴ء

☆ صلاح الدین حیدر، ڈاکٹر، ''فیض احمد فیض شخصیت و فن''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۹۹ء

☆ ضیاء ساجد، ''فیض احمد فیض''، لاہور، علیم پرنٹرز اردو بازار، ۱۹۸۴ء

☆ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ''فیض کی تخلیقی شخصیت: تنقیدی مطالعہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

☆ طاہر مسعود، ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے''، کراچی، مکتبہ تخلیق، ۱۹۸۵ء

☆ ظفر اللہ پوشنی، ''زندگی زندہ دلی کا نام ہے''، کراچی، الحزن، ۱۹۸۷ء

☆ عائشہ جلال، ''دی اسٹیٹ آف مارشل رول''، لاہور، وین گارڈ، ۱۹۹۱ء

☆ عبداللہ ملک، ''پرانی محفلیں یاد آ رہی ہیں''، لاہور، تخلیقات، ۲۰۰۱ء

☆ عتیق احمد، پروفیسر، ''فیض عہد اور شاعری''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء

☆ علی محمد، صدیقی، ڈاکٹر، ''فیض احمد فیض درد اور رومان کا شاعر''، پیس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

☆ فارغ بخاری، ''البم''، لاہور، فنون پبل کیشنز رائل پارک، ۱۹۸۷ء

☆ فتح محمد، ملک، پروفیسر، ''تعصّبات''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

☆ فتح محمد، ملک، پروفیسر، ''فیض شاعری اور سیاست''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

☆ فتح محمد، ملک، ''اندازِ نظر''، لاہور، التحریر اردو بازار، ۱۹۸۰ء

☆ فتح محمد ملک، ''فلسطین اردو ادب میں''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

☆ فتح محمد ملک، ''تحسین و تردید''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

☆ فیض احمد فیض، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، مرتبہ: مرزا ظفر الحسن، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۱ء

☆ فیض احمد فیض، ''متاعِ لوح و قلم''، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۳ء

☆ فیض احمد فیض، ''مہ و سال آشنائی''، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۸۱ء

☆ فیض احمد فیض، ''نسخہ ہائے وفا''، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۶۴ء

☆ فیض احمد فیض، ''سرِ وادیِ سینا''، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۱ء

☆ فیض احمد فیض، ''شامِ شہرِ یاراں''، لاہور، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۱ء

☆ فیض احمد فیض، ''نثرِ تاثیر'' انتخاب و ترتیب، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء

☆ فیض احمد فیض، ''میزان''، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء

☆ فیض احمد فیض، ''دستِ صبا''، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۵۲ء

☆ گوپی چند نارنگ، ''فیض کے مغربی حوالے''، (فیض کو کیسے نہ پڑھیں)، مرتبہ اشفاق احمد، ۱۹۹۲ء

☆ محمد ایوب، خان، ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز''، کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۷ء

☆ محمد عارف، ڈاکٹر، ''فیض احمد فیض، رومان اور شاعری''، لاہور، مکتبہ جدید پریس، ۲۰۱۰ء

☆ مرزا ظفر الحسن، ''ذکر یار چلے''، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۳ء

☆ مرزا ظفر الحسن، ''خونِ دل کی کشید، فیض احمد فیض کی شخصیت اور فن کا مطالعہ''، کراچی،

مکتبہ اسلوب، ۲۰۱۰ء

☆ ممتاز حسین، پروفیسر، ''نقد حرف، فیض کی شاعری'' ۱۹۸۵ء

☆ نثار ترابی، ''فکر فیض''، لاہور، ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۱۲ء

☆ نصرت چودھری، ڈاکٹر، ''فیض کی شاعری''، لاہور، نگارشات، ۱۹۸۷ء

رسائل و جرائد

☆ ماہنامہ ''اخبار اردو''، اسلام آباد، فروری ۲۰۱۱ء

☆ ماہنامہ ''افکار''، کراچی، فیض نمبر (بیاد فیض، نومبر ۱۹۸۵ء)

☆ ماہنامہ ''فاران''، کراچی، اگست ۱۹۶۵ء

☆ ماہنامہ، ''ادب لطیف''، لاہور، فیض نمبر ۱۹۸۵ء

☆ ماہنامہ، ''بیاد فیض''، لاہور، فروری ۲۰۰۲ء

☆ سہ ماہی، ''ادبیات''، اسلام آباد، ''فیض احمد فیض نمبر''، ۲۰۰۹ء

☆ روزنامہ، ''نوائے وقت''، لاہور، ۲۲ فروری ۱۹۸۵ء

انگریزی کتب:

1. Abid Ali, Syed, 2005, "The Way It Was",Lahore,Baber Ali Foundation

2. Ahmad salim, Humaira Ashfaq, 2012,"Faiz, Folk Heritage and Problems of Culture", Lahore, Sang-e-Meal Publications

3. Alys Faiz, 1985," Dear Heart To Faiz in prison", Lahore ,Ferozesons

4. Ayls Faiz,1993, "over my shoulder",Lahore,Frontier post publication

5. Faiz Ahmad Faiz,1998, "The Uni corn and dancing girl", new dehli

6. Faiz Memorial Lecture, London,Urdu markez

7. Faiz Ahmad Faiz,1975,"Problems Of National Art and Culture",Lahore

ضمیمہ جات